سلسلۂ اشاعت امامیہ مشن پاکستان رجسٹرڈ لاہور ۱۳

تجارت اور اسلام

از افادات
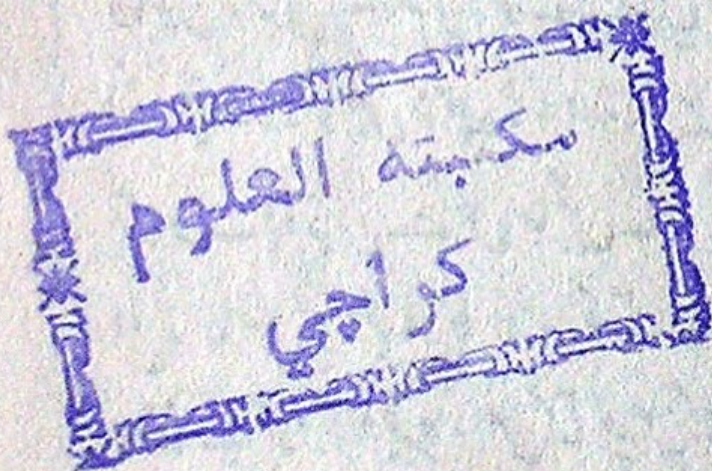
حضرت سید العلماء مولانا سید علی نقی النقوی
مجتہد العصر مدظلہ

قیمت ۱۰ آنے

محصول ۱ر

امامیہ مشن پاکستان لاہور کی تبلیغی خدمات کا پندرھواں قابل فخر شاہکار

"تجارت اور اسلام" آپکے پیش نظر ہے۔ جو امامیہ مشن لکھنؤ سے دو بار اشاعت پذیر ہو چکا ہے یہ خلاصہ ہے سرکار سید العلماء کے ان کامیاب لیکچرز کا جو محرم ۱۳۵۲ھ میں مدرسۃ الواعظین لکھنؤ میں "امراض قومی اور انکا علاج" کے موضوع پر بیان ہوئے۔

زندگی کے مادی تصور کی تنگی کو اسلام کی زندہ اور ہمہ گیر نورانی تعلیمات کی روشنی میں اس خوبصورتی سے نکھار اور سنوار کر پیش کیا گیا ہے کہ جامد ذہن اور معطل قویٰ میں فوراً ایک صالح تغیر کا احساس ہونے لگتا ہے۔ رزقی معیشت اور تجارتی سرگرمی کیلئے دماغ میں نیا رجحان پیدا ہوتا ہے۔ بہت سے غیر اسلامی ادبار پرور خیالات جو زندگی کے میدان جدوجہد میں بزدل بنا دیتے ہیں انکی تردید کی گئی ہے۔

بدھ ازم اور عیسائیت کی رہبانیت یورپ اور امریکہ کی فساد انگیز سرمایہ داری دونوں کے ضرررساں عناصر کی نشاندہی کر کے اسلام کی معتدل عملی تعلیم کو دلنشین انداز سے پیش کر کے اسلام کی کامیاب وکالت کا حق ادا کیا ہے۔

حصول معاش خصوصاً رغبت تجارت کے متعلق معصوم ہادیوں کے اشارات آج کے تعلیم یافتہ دماغوں کو قبول اسلام کی دعوت دیتے ہیں۔ کیونکہ ان سے بلند تر تعلیم کوئی مفکر پیش نہیں کر سکتا مثلاً "تجارت کو کبھی نہ چھوڑنا ورنہ ذلیل ہو جاؤ گے" "اگر تم نے تجارت چھوڑ دی تو تمہارے اموال تمہارے ہاتھوں سے نکل جائیں گے" "رزق کا نوے فیصدی حصہ تجارت میں ہے" "حلال مال کو حاصل کرنا جہاد کا درجہ رکھتا ہے" "دراصل زہد و اتقا یہ ہے کہ دنیا کے حرام مال سے اجتناب کرو" وغیرہ۔ اس کتابچہ میں عملی زندگی کے اہم مضامین مثلاً مذموم سرمایہ داری "مستحق فارغ البالی کا معیار" "ترک دنیا کا روشن پہلو" مسئلہ تقدیر، خدا کا رازق ہونا، قناعت کا مفہوم، مال دنیا کے حصول کی پستی، ترک دنیا کی قباحت، اجتماعی نظام کی مضبوطی کیلئے انفرادی ترقی کی ضرورت وغیرہ وغیرہ خوبصورتی سے کھول دیئے گئے ہیں۔ اس رسالہ کی توسیع اشاعت مسلمانوں میں خوشگوار عملی انقلاب پیدا کر سکتی ہے

واعظین و ذاکرین اور پیش نمازوں کو مندرجہ مضامین پبلک تک پہنچا کر خدمت اسلام و مسلمین کا حق ادا کرکے اراکین امامیہ مشن کو شکریہ کا موقعہ دینا چاہئے۔ امید کہ اہل نظر و فکر اس رسالہ کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ والسلام۔ فروری ۱۹۶۷

خادم ... حسن ... علی شاہ کاظمی سیکرٹری امامیہ مشن - پاکستان (رجسٹرڈ)، لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

تمہید

امراض قومی اور ان کا علاج

دواؤک فیک ولا تبصر — وداؤک منک ولا تشعر
وتزعم انک جرم صغیر — وفیک انطوی العالم الاکبر

نور وظلمت، سیاہی اور سفیدی، حرارت و برودت کی طرح صحت اور مرض دو متضاد حالتیں ہیں۔

ایک ذی روح کے جسم کا حد اعتدال میں ہونا ہر وقت کا اپنے پیمانہ پر کام کرنا اور ہر پرزہ کا ٹھیک طور سے مصروف عمل ہونا صحت ہے اور اسی جسم کا اپنے مزاج فطری سے ہٹ جانا، کسی قوت کے کام میں نقصان پیدا ہو جانا، کسی پرزہ کا معطل ہو جانا۔ یا کم از کم اپنے کام کو ٹھیک طور پر انجام نہ دینا مرض ہے۔

مرض کا علاج اگر شروع ہی شروع میں کر لیا جائے تو اکثر اس کا برطرف ہو جانا آسان ہوتا ہے۔ لیکن جب مرض دیرپا ہو جائے اور اسکی

جڑیں طبیعت کے اندر جم جائیں ۔ تو پھر اس کا علاج دشوار ہوتا ہے یا کبھی غیر ممکن العلاج بن جاتا ہے ۔ مگر امراض سب یکساں نہیں ہوتے بعض ایسے ہوتے ہیں کہ انسان کو خود اس کا بیّن طریقہ پر احساس ہوجاتا ہے جیسے اٹھا ہوا درد یا ٹپکتا ہوا پھوڑا ۔ وہ فطری تکلیف اور وجدانی اذیت جو حاصل ہوتی ہے وہی انسان کو اس کا پتہ دے دیتی ہے ۔ لیکن بہت سے امراض ایسے ہوتے ہیں ۔ جن کا نتیجہ اتنے محسوس طریق پر ظاہر نہیں ہوتا کہ انسان فوراً اس کو سمجھ لے ۔ بلکہ اکثر ابتدائی منزل میں کہ جب اس کا علاج آسان ہے اس کا اندازہ نہیں ہوتا ۔ اور جس وقت خبر ہوتی ہے اس وقت وہ قابلِ علاج ہونے کی حد سے گزر چکا ہوتا ہے ۔ اور علاج اس کا دشوار یا ناممکن بن چکا ہوتا ہے ۔ جیسے دق کے متعلق کہا جاتا ہے ۔ کہ اگر پہلے درجہ میں اس کی اطلاع ہوجائے ۔ تو فوراً علاج آسان ہے ۔ اور اگر دوسرے درجہ میں خبر ہو تو علاج مشکل ہے ۔ اور تیسرے درجہ میں انتہائی مشکل ، لیکن افسوس ہے کہ اس مرض کا احساس اکثر اسی وقت ہوا کرتا ہے کہ جب وہ دوسرے یا تیسرے درجہ کی حد تک پہنچ چکا ہے ۔ اس وقت خبر بھی ہوئی تو کیا فائدہ ۔ اس لئے کہ علاج کا وقت گزر چکا ہوتا ہے ۔ اس کے لئے بے شک ضرورت اسی بات کی ہے کہ انسان ماہر ترین اطباء کی طرف رجوع کرکے اپنی جانچ کرائے اور اس کے لئے ضروری امر ہے کہ اگر طبیب اس کی بیماری کا احساس

کر کے حکم لگا دے۔ کہ وہ بیمار ہے۔ تو یہ اس کے قول کو اپنے ذاتی خیال پر مقدم سمجھ کر علاج میں مصروف ہو جائے۔ اسوقت کامیابی کی توقع ہے۔ لیکن اگر طبیب کہتا رہا کہ تم بیمار ہو۔ مگر یہ اپنی ظاہری حالت پر بناء کر کے پورے طور سے اس عقیدہ پر قائم رہا کہ میں صحیح وسالم ہوں۔ اور اس لئے علاج کرنے کے بدلے وہ خود طبیب کا مذاق اڑاتا رہا تو ایسے شخص کے لئے کبھی صحت کی امید نہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ مرض کے لئے اس کی جہالت آغوش تربیت ہے اور نشوونما کے ساتھ حدکمال پر پہنچنے کے بعد اس کا استیصال طاقت بشری سے باہر نتیجہ کیا ہے؟ وہی ایک یعنی ہلاکت۔

افسوس ہے کہ اس وقت قوم کے امراض کی نوعیت یہی ہے قوم بحالت موجودہ مریض ہے اور انتہائی مریض لیکن اس کو اپنے مرض کا احساس نہیں رہا۔ اگر کوئی طبیعت شناس نباض بتلاتا بھی چاہے کہ وہ بیمار ہے تو کیا فائدہ۔ جبکہ وہ یقین کرنے پر تیار نہیں لیکن پھر بھی یہ فرض عائد یقیناً ہوتا ہے کہ نبض شناس فرد قوم نے جب مرض کا احساس کر لیا تو وہ اپنے خیالات کا اظہار ضرور کر دے۔ اس پر توجہ ہونا اور نہ ہونا دوسرا امر ہے۔

اکثر اوقات کسی خاص تغیر کا احساس اس وجہ سے نہیں ہوتا کہ اس کی رفتار تدریجی حیثیت سے زمانہ کے امتداد کے

ساتھ تھی اور انسانی طبیعت پر بھی برابر اسی رفتار زمانہ کی پابند۔ دھوپ پر آنکھ جمائے رہنے والا کبھی اس کا احساس نہ کرے گا کہ وہ متحرک ہے۔ بلکہ وہ دیکھنے میں اس کو ایک ہی جگہ پر قائم سمجھے گا۔ حالانکہ اس کی رفتار کا سلسلہ جاری ہے۔ بے شک اگر سو گیا اس وقت کہ جب دھوپ مغربی دیوار کے گوشہ سے متصل تھی اور بیدار ہوا اس وقت کہ جب وہ مشرقی دیوار تک پہنچ چکی تو اس وقت اسے احساس ہو گا کہ دھوپ نے کس قدر راستہ منقطع کیا۔

بس اسی صورت سے قوم کا تنزل چونکہ تدریجی حیثیت سے ہے اور زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ، اور افراد قوم اسی زمانہ کی رفتار میں زندگی کی منزلیں قطع کرنے والے، لہٰذا انہیں بین طریقہ پر اپنے حالات کے انقلاب کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اس کی صورت یہی ہے کہ درمیانی کڑیاں نظر انداز ہوں، تاریخ نے سابقہ حالات کا فوٹو اپنے اندر الفاظ کی صورت میں محفوظ کر لیا ہے۔ اس کے اوراق کو الٹ کر آج سے پچاس، سو، دو سو برس اور اسی طرح آگے بڑھ بڑھ کر موجودہ پیش نظر حالت کے ساتھ اس کا تقابل کرتے جائیے۔ تو معلوم ہو کہ ہم کیا تھے۔ اور کیا ہو گئے۔

ہم ایک وقت میں عظمت و اقتدار کے مالک تھے ہمارے

نام کا سکہ دنیا میں چل رہا تھا۔ ہمارے سامنے دنیا سر تسلیم خم کئے ہوئے تھی۔ ہمارے اخلاق دنیا کے لئے سبق آموز تھے ہمارے تعلیمات دنیا کے معلّم تھے۔ ہمارے قدم سب سے آگے تھے۔ اور ہم دُنیا کے رہنما و مقتدار و پیشوا تھے، لیکن اب کیا ہوا؟ اب یہ ہوا کہ ہم سب کے پیچھے ہیں اور دنیا ہم سے آگے ہمارے عظمت و اقتدار کا قلعہ نیست و نابود ہو چکا ہے۔ ہماری بنیادیں متزلزل ہیں، ہمارے شعائر پامال ہیں۔ ہمارے مقاصد پیوند خاک ہیں۔ ہم دنیا میں ذلّت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور دنیا کے ذلیل ترین اقوام ہم سے بلند سمجھے جاتے ہیں۔ آخر یہ کیا ہوا؟ کدھر گئی ہماری عظمت اور کہاں گیا ہمارا اقتدار اور کیا ہوا ہمارا وقار؟ بے شک بتلا دیا ہے اسی خدا نے جو عزت کا اصلی مالک ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ	"خدا تغیر و تبدل نہیں پیدا کرتا کسی قوم میں جب تک کہ وہ قوم اپنے نفسانی حالات میں تغیر پیدا نہ کردے،"

دوسری آیت:۔

ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ لَمْ یَکُ مُغَیِّرًا نِّعْمَۃً اَنْعَمَھَا عَلٰی قَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا	بات یہ ہے کہ خدا کسی اس نعمت کو جو کسی قوم کو عطا کی ہے اس وقت تک

مَا بِاَنْفُسِهِمْ سلب نہیں کرتا جب تک کہ وہ خود اپنے حالات میں تغیر پیدا نہ کر دے"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر ہمارے قومی حالات میں تغیر پیدا ہوا ہے تو اس کے اسباب کی تلاش ہم کو خود اپنے ہی اندر کرلینا چاہیئے اور لسان قدرت کے بزرگ ترین ترجمان امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے دونوں شعروں میں جو میرے اس بیان کا سرنامہ ہیں۔ اسی کو ارشاد فرمایا ہے۔

"بیشک تمہاری دوا خود تمہیں میں موجود ہے۔ لیکن تم آنکھ کھول کر دیکھتے نہیں اور مرض کا اصلی منشاء خود تمہارے ہی اندر ہے، لیکن تم کو احساس نہیں تم سمجھتے ہو کہ ہماری ہستی ایک مختصر جسم میں محدود ہے۔ حالانکہ تم میں حقائق و اسرار کا بہت بڑا عالم مضمر ہے۔"

بے شک مرض کی تشخیص سب سے پہلی اور بہت بڑی کامیابی ہے پھر اس مرض کے اسباب کی تلاش دوسری منزل ہے اور اس کے بعد ان اسباب کے استیصال کی فکر اور مرض کے علاج کی کوشش آخری نتیجہ ہے ؁

قوم کا پہلا مرض اور اُس کا علاج

درآمد و برآمد کا عدم توازن

انسان کا دورِ زندگی تین حصوں میں منقسم ہے سِن نشو و نما سِن وقوف اور سِن انحطاط اس لیئے کہ قدرت نے اس کے نظامِ زندگی کو تجدد و تغیر پر مبنی قرار دیا ہے۔ اور اس کی بقاء کو غذائے خارجی کا پابند۔ اس کے جسمانی اجزاء زمانہ کی رفتار کے ساتھ تحلیل ہوتے رہتے ہیں لیکن غذا کہ جو جسم میں پہنچتی ہے اس کا لب لباب اور جوہر لطیف انسان کا جزوِ بدن ہو کر تحلیل شدہ اجزاء کی قائم مقامی کرتا ہے۔ اور اسی بدل یا تحلیل کی بدولت انسان کا نظامِ حیات قائم رہتا ہے۔ ابتدائی دور میں جتنے اجزاء جسم کے تحلیل ہوتے ہیں۔ اس سے زیادہ مقدار غذا کی اس کا جزو بدن ہوتی ہے اس لیئے اس کا جسم ترقی کرتا رہتا ہے اور روز بروز قوت و طاقت میں اس کی اضافہ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ایک کامل جوان کی حد تک پہنچتا ہے جو ترقی کی آخری منزل ہے۔ اب شروع ہوا سن وقوف۔ اس میں جتنی قوت انسان کے جسم سے تحلیل کی بدولت جاتی ہے۔ اتنی ہی بدل کی صورت میں انسان کے جسم میں آجاتی ہے۔ اسکا نتیجہ ہے کہ اُس کی حالت میں نہ زیادتی ہو اور نہ کمی بلکہ وہ ایک حالت پر ٹھہرا رہے

اس کے بعد شروع ہوتا ہے۔ تیسرا دور جس کا نام ہے سن انحطاط۔ یہ وہ ہے کہ جس میں انسان کے جسم سے تحلیل زیادہ ہو اور بدل کی صورت میں پیدا کم ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان روز بروز کمزور ہوتا جائے۔ اور اُس کی قوتیں مضمحل ہوتی جائیں، اسی کا انجام ہے موت، جس کا دوسرا نام ہے فنا۔

بس اسی اصول کے مطابق اگر آپ کو کسی قوم کے دور ترقی دور وقوف، دور تنزّل کا پتہ لگانا ہو تو یہ دیکھیئے کہ اس قوم سے دوسروں کے پاس کتنا جاتا ہے اور دوسرے اقوام سے اُس کے پاس کتنا آتا ہے۔

اگر آپ نے دیکھا کہ جتنا اس کے ہاتھوں سے دوسروں کے پاس جاتا ہے اُس سے زیادہ دوسروں کے پاس سے اسکے پاس آجاتا ہے۔ تو یقیناً یہ قوم ترقی کر رہی ہے۔ اور اسکی طاقت وقوت میں روز بروز افزونی ہی ہوگی۔ اور اگر ایسا ہے کہ بس جس قدر دوسروں کے پاس سے اُس کے پاس آتا ہے۔ اتنا ہی اس کے پاس سے دوسروں کے پاس چلا جاتا ہے تو پھر غنیمت ہے۔ سمجھئے کہ قوم ایک حالت پر قائم ہے۔ اُس کے لئے اس صورت میں نہ ترقی ہوگی نہ تنزل۔ لیکن اگر کہیں ایسا ہوا کہ جتنا دوسروں کے پاس سے آتا ہے۔ اس سے زیادہ اس کے پاس سے دوسروں کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے۔ تو سمجھئے کہ یہ ہے دورِ تنزّل۔ اسکا نتیجہ

ہے کہ روز بروز ناتوانی و کمزوری میں اضافہ ہو۔ اور آخری انجام یہ ہے کہ قوم صفحۂ ہستی سے فنا ہو جائے۔

اس معیار کے مطابق جب ہم اپنی قوم کی حالت پر غور کرتے ہیں تو افسوس کی انتہا نہیں رہتی، ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ غیروں کے پاس جا رہا ہے اور غیروں کے پاس سے ایک حبہ بھی ہمارے پاس نہیں آسکتا۔ ہماری سابقہ دولتیں موروثی اموال، برسوں کے نہفتہ ذخیرے، جائدادیں، زمینیں سب دوسروں کے پاس پہنچ گئیں۔ لیکن ہمارے ہاتھ میں کیا آیا؟ کچھ نہیں۔ اس صورت میں تو اگر خزانۂ قارون بھی ہوتا، تو وہ ختم ہو جاتا۔ اور آخر اس میں خاک اڑنے لگتی۔ کنوئیں سے پانی کھینچتے رہئے۔ وہ پایاب رہے گا۔ مگر اس وقت تک جب تک کہ اس میں سوتے ہیں۔ یعنی جتنا کھینچتے ہیں اتنا آجاتا ہے لیکن اگر اس کے حلقۂ اتصال کو مرکز آب سے قطع کر دیجئے تو یقین سمجھئے کہ وہ بہت جلد خشک ہو گا۔ اس لئے کہ اس میں برآمد کے ساتھ درآمد کا سلسلہ باقی نہیں رہا ہے۔

حیات انسان کی بنیاد دوران خون پر ہے۔ یہی رگوں میں دوڑتا ہوا خون وہ ہے جس پر نظام زندگی قائم ہے۔ بیشک اس خون کو متحرک رہنا چاہئے۔ اور سیال، نظام زندگی قائم رہے گا لیکن اسی وقت کہ جب تک یہ خون عروق و شرائن کے

راستوں سے ہر پھر کر جسم کے اندر رہتا ہے۔ لیکن اگر شہرگ قطع ہوگئی یا ہاتھ کی متحرک نبض کٹ گئی اور یہ خون بہنا شروع ہوا۔ تو یقین جانیئے کہ اس کا نتیجہ ہے موت، بس اسی طرح سمجھ لیجئے کہ ایک قوم کی بقائے زندگی اسی وقت ہوسکتی ہے کہ جب تک اس کا سرمایہ ہر پھر کر اسی قوم کے افراد کے پاس رہتا ہے لیکن اگر منتقذ ہو گیا۔ سیال کہ جس میں سے یہ سرمایہ نکل نکل کر باہر جانے لگا۔ اور اس کی کوئی روک نہ ہوئی نہ اس کا کوئی بدل حاصل ہوا تو یقیناً اس قوم کا آخری نتیجہ ہے فنا، اب دیکھ لیجئے خود کہ آپ کی قوم کی بھی یہی حالت ہے یا نہیں؟

یہ کیوں؟ اس لیے کہ تمام وہ ذرائع و اسباب ترک کر دیئے جن سے حصولِ آمدنی کا امکان ہے۔ اور وہ تمام باتیں اختیار کر لیں جن سے دوسروں کو نفع پہنچنے کا موقع ہے۔ ضروریات زندگی کو اتنا وسیع کیا۔ کہ ہر شے کی احتیاج زیادہ سے زیادہ ہم کو ہو گئی اور خود ان ضروریات کے پورا کرنے کا سامان نہ کیا۔ تاکہ ہمارے ضروریات خود ہم ہی سے پورے ہوتے نتیجہ یہ ہوا کہ وقتی ضروریات پورے ہوئے۔ مگر اس طرح کہ ہماری دولت اور غیر کا خزانہ۔

پھر اس کا علاج؟ علاج یہی ہے کہ ایسے ذرائع کو دوبارہ

اختیار کرو جن سے تمہارا روپیہ تمہاری ہی جیبوں میں رہے۔ یا اگر دوسرں کے پاس جائے تو دوسرے کے پاس سے بھی اسی تناسب سے تمہارے پاس آجائے۔

تجارت، صنعت و حرفت اور زراعت یہی چیزیں وہ ہیں جن سے قوموں کی زندگی ہوتی ہے اور ان ہی چیزوں کا ترک کرنا وہ تھا کہ جس نے ہماری قوم کو اس درجہ تنزل تک پہنچایا۔ اب اگر قوم زندہ ہونا چاہے تو ان ہی ذرائع کو پھر اختیار کرنا پڑے گا۔ جو اس کی زندگی کے باعث ہوں اور اس کو معراج ترقی تک پہنچانے کے ذمہ دار ہو سکیں۔

مرض کا سبب اصلی

افرادِ قوم کی ذہنیت اور غلط خیالات کی پیداوار

انسان کا طرزِ عمل حقیقتاً اس کی ذہنیت کا پابند ہوتا ہے۔ انسان کے اندر عملی کمزوری اکثر ان خیالات کے تحت میں ہوتی ہے۔ جو اس کے دل و دماغ میں راسخ ہو گئے ہیں۔ اس لئے جب ہم اس مرض کے متعلق غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت وہ کچھ خیالات کا نتیجہ ہے۔ جو افراد ملت کے دماغ میں غلط طور پر قائم ہو گئے ہیں

اور وہ اکثر افراد کے زبان وقلم پر بھی آجایا کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم مختصر طور سے ان خیالات کا جائزہ لے کر ان کی جانچ کریں گے۔ کہ وہ کہاں تک حقیقت سے مطابق ہیں۔

پہلا خیال اور اس کا دفعیہ

سب سے پہلا خیال یہ ہے کہ اسلام نے ترکِ دنیا کی تعلیم دی ہے۔ اور طلبِ دنیا سے منع کیا ہے۔ دین و دنیا کا اجتماع ممکن نہیں ہے اور اس لئے انسان کو دین کے ساتھ دنیا کا طالب ہونا خیال خام ہے۔ ائمہ معصومینؑ نے اپنے اقوال و افعال سے ہمیشہ دنیا طلبی کو ممنوع ثابت کیا ہے اور حضرت امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دنیا کو تین مرتبہ طلاق دے دیا تھا۔ لہٰذا مسلمانوں کے لئے اپنے اسلامی احکام کے تحت میں مال دنیا کی تحصیل میں کدوکاوش کرنا صحیح نہیں ہے۔

یہ خیال وہ ہے جو اکثر دماغوں میں موجود ہے اور اکثر پڑھے لکھے افراد تک اس غلط فہمی کا شکار ہیں۔ جن میں قدیم و جدید تعلیم یافتہ دونوں ہی داخل ہیں، فرق اتنا ہے کہ قدیم تعلیم یافتہ اس کو مسلمہ طور پر احکام اسلامی کے سامنے سرِ نیاز خم کرتے ہوئے اپنے طرز عمل کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے پیش کرتے ہیں۔ اور جدید تعلیم یافتہ اس کو احکام اسلامی کے خلاف لبطور اعتراض پیش کرتے ہوئے

"اسلام مانع ترقی ہے" کی آواز بلند کرتے ہیں۔ لیکن اگر صحیح اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس خیال پر نظر کی جائے تو اس کی کمزوری طشت ازبام ہو جائے گی اور معلوم ہو گا کہ وہ واقعیت سے کوسوں دور ہے۔

انسان کے اندر قدرت نے دو جزو ودیعت کئے ہیں۔ ایک مادہ اور دوسرے روح۔ بے شک یہ دو جزو اس کی ہستی میں لازم و ملزوم ہیں اور ہر ایک کے لئے ایک خاص حیثیت سے ترقی ہے اور اس کے کچھ خصوصیات ہیں۔ انسانی افراد کے طرزِ عمل اور مختلف اقوام کی تعلیمات پر جب نظر کی جاتی ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان دونوں پہلوؤں میں سے کسی ایک کی نگہداشت میں افراط و تفریط کی حدوں میں منقسم ہو گئے ہیں۔ بعض مادیت کے اندر اتنے مستغرق ہوئے کہ انھوں نے روح کے وجود ہی سے انکار کر دیا۔ اور انسان کی ہستی کو اسی جسمانی ترکیب و تالیف میں محدود سمجھ لیا۔ اس لئے اس کا آخری نقطۂ مقصد جو کچھ قرار پایا وہ مادی خواہشات کا پورا کرنا اور جسمانی راحت و آرام کے اسباب مہیا کرنا اور بس، اکثر افراد ایسے بھی تھے کہ جو عقیدہ کے اعتبار سے روح کے وجود کے منکر نہیں ہیں۔ لیکن عملی حیثیت سے سوائے مادی خواہشات کے پورا کرنے کے ان کا کوئی نصب العین نہ رہا ان کی عمر گزری اپنے طاقت و اقتدار کے مظاہرہ، رعب و جلال

کا سکہ قائم کرتے، مظلوموں کا گلا کاٹنے، حقوق غصب کرنے اور جس صورت سے ہو اپنے سرمایہ ذاتی اور مفاد شخصی کو تقویت پہنچانے میں اور بس۔ یہ مادہ پرستی یا مادہ پروری کا نقطۂ افراط ہے جس میں روحانیت بالکل معدوم نظر آتی ہے۔

دوسرا گروہ اپنے مذاق کے مطابق روحانیت کی طرف اتنا متوجہ ہوا کہ اس نے مادی ضروریات کو بالکل پسِ پشت ڈال دیا۔ بودھ مذہب اور عیسائی راہبوں کے تعلیمات میں اس عنصر کی کمی نہیں ہے۔ افراد بشر سے تعلقات قطع کر کے آباد شہروں کی سکونت کو چھوڑ کر ویرانہ بسانا اور پہاڑوں کی کھوہوں کے اندر عبادت پروردگار میں مصروف ہو جانا اور ماسوی اللہ سے بخیال خود کسی تعلق کا قائم نہ رکھنا اس تعلیم کے خاص جوہر ہیں۔ یہ پہلے خیال کے تقابل سے نقطۂ تفریط ہے۔ جس میں مادی ضروریات کو ناقابل اعتنا قرار دینے یا فنا کر دینے کی کوشش مضمر ہے اور خالص روحانیت کو ترقی دینے کا خیال مدنظر معلوم ہوتا ہے۔

لیکن یہ کلیہ ہے کہ ہر جذبہ جب تک حدِ اعتدال میں ہے، حق بجانب ہوگا اور ادھر حدِ اعتدال سے خارج ہوا اس کے کمال میں نقص پیدا ہوا۔

مذہب اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت جس میں وہ تمام دیگر مذاہب سے ممتاز ہے یہی ہے کہ اس کے تعلیمات میں حدِ اعتدال

کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اور ہمیشہ افراط و تفریط کے نقطوں کو بچا کر جادۂ وسط کی رہنمائی کی گئی ہے۔ اور اسی بناء پر ارشاد کیا گیا تھا۔ کہ

جَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا "ہم نے تم کو امت وسط یعنی جمعیت عادلہ قرار دیا"

بے شک نقطۂ وسط ہی وہ ہوتا ہے۔ جہاں آگے بڑھ جانے والوں کو پیچھے واپس آنا اور پیچھے رہنے والوں کو بڑھ کر پہنچنا لازم ہے اصل منزل سے پیچھے رہ جانے والا جس طرح منزل سے ابھی دور ہے۔ اسی طرح منزل کو چھوڑ کر آگے بڑھ جانے والا اگر اپنے سلسلۂ رفتار کو جاری رکھے تو منزل سے دور ہی ہوتا جائے گا۔ ایک خاص شہر کے ارادہ سے ریل پر بیٹھنے والا جس طرح اس کا دھیان رکھے کہ وہ اس منزل سے پہلے کسی دوسرے اسٹیشن پر نہ اتر پڑے ویسے ہی اس کا خیال بھی رکھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ سوتا رہے اور اسٹیشن پیچھے ہی چھوٹ جائے، دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہے اور وہ شخص منزل پر پہنچنے سے محروم۔ اسلام نے اس مادیت و روحانیت کے مسئلہ میں بھی حدِ اعتدال کو ملحوظ رکھا ہے۔ اس نے جس طرح مادیت پرستی کو پامال کیا اور خالص مادیت کی بنیادوں کو ملیامیٹ کیا ہے اسی طرح اس کو یہ بھی منظور نہ تھا کہ اس مادی زندگی سے بالکل آنکھیں ہی بند کر لو اور اپنے جسمانی زندگی کے ضروریات کو بالکل ہی ترک کر دو۔

اگر اسے اس مادی زندگی سے کنارہ کشی جائز قرار دینا ہوتی، تو
خودکشی کو حرام قرار نہ دیتا۔ اس لئے کہ اس میں تو حقیقی معنی
روح کو اس جسمانی قید سے آزاد کرنے کا نتیجہ حاصل ہوتا ہے
اس نے لَاتُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ کہہ کر خودکشی کو ا
جرم قرار دے دیا۔ اور حفاظتِ نفس کو انسان کا فریضہ لازمہ
اس نے لَا رُھْبَانِیَّۃَ فِی الْاِسْلَامِ کہہ کر اس نام نہاد روحانیت
خاتمہ کر دیا، جو اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب میں رائج
اور جو نظام اجتماعی و تمدنی کے لئے سم قاتل کا حکم رکھتی
اس نے دنیا و آخرت کے درمیان کوئی ایسی سدِ محکم قرار
دی ہے۔ کہ جس کا ٹوٹنا ممکن نہ ہو۔ بلکہ اس نے ان دونوں
لازم و ملزوم، دست و گریبان قرار دے کر چاہا ہے کہ وہ دو
اس طرح سمو جائیں کہ دنیا، دنیا اور آخرت، آخرت نہ رہے
دنیا بھی تمہید آخرت بن کر منزل آخرت قرار پا جائے۔ یہی معنی
قول جناب رسالتمآبؐ کے:

اَلدُّنْیَا مَزْرَعَۃُ الْاٰخِرَۃِ — دنیا آخرت کے لئے کھیتی کی مثال ہے

جس طرح انسان کھیتی کر کے اس کے ثمر کو حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح
انسان دنیا کی آرائش اسی طرح کرے کہ اس کا نتیجہ خیر آخرت
حاصل ہو۔

یہ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ دنیا کو آخرت کے منافی سمجھ

اس سے بالکل کنارہ کشی اختیار کرے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے نفس پر قابو اور اپنے ضمیر پر اقتدار نہیں رکھتا۔ وہ دنیاوی اسباب زندگی کو اس طرح صرف کرنا نہیں جانتا کہ ان سے آخرت کی منزل حاصل ہو سکے۔ اسلامی کتاب معجز اور فرمان محکم قرآن مجید کی تعلیم تو یہ ہے:-

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً — خداوندا ہم کو دنیا میں اپنی ایک نعمت عطا کر اور آخرت میں ایک

اور پھر صریحی طور سے ارشاد کیا۔ کہ:-

وَلَا تَنْسَ نَصِیْبَكَ مِنَ الدُّنْیَا — یعنی تمہارا دنیا میں حصہ موجود ہے۔ اس کو بھول نہ جانا۔

اور رہنمایان مذہب کی آوازیں ہیں کہ دنیا کو بالکل ترک کر دینا غلطی ہے۔ رسول صلعم کے بعد دنیائے اسلام کے سب سے بڑے معلّم روحانی امیر المومنین ؑ نے فرمایا ہے۔ اس وقت جبکہ علاء بن زیاد نے اپنے بھائی عاصم بن زیاد کی شکایت کی کہ اس نے لباس تصوّف پہن کر دنیا سے بالکل علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ حضرت نے فرمایا۔ کہ اس کو میرے پاس لاؤ۔ چنانچہ وہ شخص حضرت کی خدمت میں حاضر کیا گیا۔ آپ نے نہایت تہدید آمیز الفاظ سے فرمایا۔

یَا عُدَیَّ نَفْسِهٖ لَقَدِ اسْتَهَامَ — اے اپنے نفس کے دشمن حقیقت

بِكَ الْخَبِيْثُ اَمَا رَحِمْتَ اَهْلَكَ وَوَلَدَكَ اَتَرَى اللّٰهُ اَحَلَّ لَكَ الطَّيِّبَاتِ وَهُوَ يَكْرَهُ اَنْ تَاْخُذَهَا

یہ ہے کہ شیطان نے تجھ کو بہکا دیا ہے اور تو نے اپنے اہل وعیال اور اولاد کا بھی خیال نہ کیا۔ کیا تو سمجھتا ہے کہ خدا نے طیبات کو حلال تو کر دیا ہے لیکن تیرا استعمال کرنا ان طیبات کو اسے ناگوار گزرے گا؟ ہرگز ایسا نہیں ۔

پیغمبر اسلام حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صریحی طور پر فرمایا:۔

لَيْسَ خَيْرُكُمْ مَنْ تَرَكَ الدُّنْيَا لِاٰخِرَتِهٖ وَلَا اٰخِرَتَهٗ لِدُنْيَاهُ بَلْ خَيْرُكُمْ مَنْ اَخَذَ مِنْ هٰذِهٖ وَهٰذِهٖ

تم میں سے وہ شخص قابل تعریف نہیں ہے جو دنیا کو آخرت کے لئے چھوڑ بیٹھے۔ اور نہ وہ جو آخرت کو دنیا کے لئے ترک کر دے۔ بلکہ اچھا وہ شخص ہے جو دنیا و آخرت دونوں میں حصہ لے۔

اسلام نے بیشک ترک دنیا کی تعلیم دی ہے۔ لیکن وہ دنیا ہو اپنے مفہوم کے اعتبار سے آخرت سے جداگانہ ہے جس کی مختصر شناخت یہ ہے کہ انسان اپنے ذاتی و شخصی مفاد کی خاطر آئینی وغیر آئینی ہر قسم کے طرز عمل پر تیار ہو جائے۔ سرمایہ شخصی

میں اضافہ کر کے اپنے افراد قوم پر بیجا تفوق کا مظاہرہ کرے اور اپنے غرور و نخوت کے سر کو بلند کرے۔ بلاشبہ یہ سرمایہ داری وہ ہے کہ جس کو اسلام نے نفرت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ وہ اگرچہ اشتراکیت کا حامی نہیں ہے اور اس راستہ کی رہنمائی نہیں کرتا جس پر اس وقت روس قدم زن ہے۔ لیکن بیشک اس نے ایک معنی سے اغنیار کے اموال میں فقرار کو شریک قرار دیا ہے یعنی فرض مذہبی کی حیثیت سے ان اغنیار پر ان کی اعانت و دستگیری کا حق عائد کر دیا ہے۔ اور ایک مخصوص مقدار اُن پر واجب الادا قرار دی ہے۔ جس کا ادا کرنا ان کا فرض ہے۔ اور اس طرح اس کے ادا کرنے پر اُن کو فقرار کے اوپر کسی احسان جتانے اور منت رکھنا کا موقع بھی نہیں دیا گیا۔ اس لئے کہ وہ تو اُن کے حق کو ادا کر رہے ہیں۔ کچھ بلا استحقاق اپنی جیب سے اُن کو عطا نہیں کر رہے ہیں۔ اس طرح اسلام نے چاہا تھا کہ مسلمانوں کی دولت اجتماعی حیثیت سے افرادِ قوم کی شیرازہ بندی میں صرف ہو۔ اور انفرادی ترقی و اجتماعی ترقی کے ساتھ توام رہے۔

لیکن افسوس ہے کہ ایک طرف اغنیائے ملت نے اپنے فرض کو ادا نہ کیا۔ امانتِ خدا کو جو درحقیقت اُن کے ہاتھوں میں ودیعت رکھی گئی تھی، اپنا ذاتی و استحقاقی مال سمجھ کر اس کو اپنے خزانوں میں محفوظ کیا۔ دوسری طرف قوم کی اکثریت

نے ترک دنیا کے اسلامی احکام کو غلط انداز نگاہ سے دیکھ کر یہ سمجھ لیا کہ کسب معیشت اور سرمایہ کی جمع آوری میں کسی قسم کی جدوجہد کرنا نفرت انگیز ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ قوم میں مجموعی حیثیت سے نکبت و افلاس نے ڈیرے ڈال دیئے اور وہ دنیا کے تمام اقوام سے زیادہ بے مایہ و تہیدست نظر آنے لگے۔ حاشا کہ اسلام کسب معیشت اور ذاتی محنت سے مال حاصل کرنے کو بُری نظر سے دیکھے۔ اس نے تو کسب معاش کو مذہبی حیثیت سے اتنی اہمیت دی کہ ارشاد ہوا :۔

طَلَبُ الْحَلَالِ جِهَادٌ — مال حلال کو حاصل کرنا جہاد کا درجہ رکھتا ہے

کبھی ارشاد ہوا :۔

اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ الْكَسْبُ الْحَلَالِ — بہترین اعمال کسب حلال ہے

امام باقر علیہ السلام کی حدیث ہے کہ رسالتمآبؐ نے فرمایا:۔

اَلْعِبَادَةُ سَبْعُوْنَ جُزْءً اَفْضَلُهَا طَلَبُ الْحَلَالِ — عبادت کے ستر جزو ہیں۔ جن میں سب سے افضل کسب حلال ہے۔

کہاں ہیں عبادت کے مفہوم پر پابندی عائد کرنے والے، اور اس کی وسعت کو تنگ بنا کر اس کو صرف نماز و روزہ، حج و زیارت میں محدود بنانے والے دیکھیں اس حدیث کو اور سمجھیں کہ اسلام شخصی عبادات کے ساتھ اجتماعی مفاد کی ترقی اور انتظام زندگی کی شیرازہ بندی کو کس طرح عبادت کا ایک اہم جزو قرار دے کر اسکا حکم دے

رہا ہے۔

اور ملاحظہ ہو۔ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ جَالِسًا مَعَ اَصْحَابِہٖ فَنَظَرُوْا اِلٰی شَابٍ ذِیْ جَلَدٍ وَقُوَّۃٍ وَقَدْ بَکَرَ یَسْعٰی فَقَالُوْا وَیْحٌ ھٰذَا لَوْ کَانَ شَبَابُہٗ وَجَلَدُہٗ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ ایک روز رسالتمآب صلعم حلقۂ اصحاب میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اصحاب کی نظر ایک جوان، توانا و تندرست اور طاقتور پر پڑی۔ جو صبح سویرے طلب معاش میں گھر سے باہر نکلا تھا۔ اصحاب نے کہا۔ کہ افسوس اس کی جوانی و طاقت جسمانی خدا کی راہ میں صرف ہوتی تو کتنا اچھا تھا۔ یہ سننا تھا کہ حضرتؐ نے فرمایا۔ کہ

لَا تَقُوْلُوْا ھٰذَا فَاِنَّہٗ اِنْ کَانَ یَسْعٰی عَلٰی نَفْسِہٖ لِیَکُفَّھَا عَنِ الْمَسْئَلَۃِ وَیُغْنِیْھَا عَنِ النَّاسِ فَھُوَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَاِنْ کَانَ یَسْعٰی عَلٰی اَبَوَیْنِ ضَعِیْفَیْنِ اَوْ ذُرِّیَّۃٍ ضِعَافٍ فَیُغْنِیْھِمْ وَیَکْفِیْھِمْ فَھُوَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَاِنْ کَانَ یَسْعٰی تَکَاثُرًا وَتَفَاخُرًا فَھُوَ فِیْ سَبِیْلِ الشَّیْطَانِ

ایسا نہ کہو کہ اس لئے کہ اگر یہ اپنے نفس کے لئے جدو جہد کرتا ہو کہ اسے لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے سے محفوظ اور لوگوں سے مستغنی کرے تو وہ حقیقتاً خدا ہی کی راہ میں مصروف ہے۔ اور اگر وہ ضعیف العمر ماں باپ یا کمزور اولاد کے لئے سعی و کوشش کر رہا ہے۔ تاکہ انہیں لوگوں سے مستغنی بنائے اور امداد پہنچائے تو بھی خدا کی راہ میں ہے

بے شک اگر ذاتی گھمنڈ اور نخوت
وغرور کرنے کے لئے جد وجہد کرتا ہو
تو وہ شیطان کے راستے پر ہے۔

اس حدیث سے مطلب بالکل صاف ہو گیا۔ اور معلوم ہوا کہ
کس طرح نیت واقعیت اور اس کے حکم کو بدل دیتی ہے۔ اب
اسلام کے ترک دنیا کے احکام کو مطلق کسب معیشت اور طلب
حلال پر منطبق کرنا صریحی غلطی نہیں تو کیا ہے۔

اس سب کے ساتھ رؤساء ملت اور رہنمایان اسلام کے طرز عمل
اور سیرت پر نظر کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے عملی حیثیت
سے اس خیال کے پرخچے اڑا دیئے ہیں، سب سے پہلے یہ یاد رکھنا
چاہیئے کہ رسالتمآبؐ نے نبوت سے پہلے تاجرانہ زندگی اختیار کی اور
ایک مرتبہ حضرت ابو طالبؑ کی معیت میں اور دوسری مرتبہ اموال جناب
خدیجہؓ کو لے کر تنہا شام کی جانب تجارت کے لئے تشریف لے گئے
اور یہی تجارت وہ تھی جو تمہید بعثت قرار پائی۔ اسی سلسلہ میں حضرت
خدیجہؓ کو آپؐ کی جانب میلان طبعی پیدا ہوا۔ اور حضرتؐ کی شادی
خدیجۃ الکبریٰ رضؓ کے ساتھ ہو گئی جس کے بعد اسلام کی ترقی کے لئے
مالی دشواریوں کا سوال برطرف ہوا اور حضرت کو تبلیغ اسلام کا حکم ہوا
عقیدہ کی بنا پر رسولؐ کا فعل جس طرح بعد بعثت لازم الاتباع ہے اسی
طرح قبل بعثت۔ اس لئے کہ عصمت جو ان کے طرز عمل کو یقینی طور سے

قابلِ تقلید بنانے کی ذمّہ دار ہے۔ وہ اُن کی زندگی کے ہر دور میں موجود تھی۔

جناب رسالتمآبؐ کے بعد آئمہ معصومین علیہم السّلام جو آئینِ شریعت کے حقیقی نگہدار تھے انہوں نے برابر اس طرزِ عمل کو قائم رکھا۔ وہ کسبِ معیشت کے سلسلہ میں اپنی ذاتی محنت کے صرف اور کدوکاوش کو اپنے لئے عار و ننگ نہ سمجھتے تھے اور نہ اسے ترکِ دنیا کے خلاف تصوّر کرتے تھے۔ امیرالمومنین علی ابن ابی طالبؑ جن کے متعلق بڑے زور و شور سے پیش کیا جاتا ہے کہ حضرت نے دنیا کو طلاق دے دیا تھا اور واقعہ بھی یہی ہے جس کے نوعیت کی تشریح بعد میں ہوگی آپ کے متعلق امام جعفر صادقؑ کا ارشاد ہے۔ کہ

اِنَّ اَمِیرَ الْمُؤْمِنِینَؑ اَعْتَقَ اَلْفَ مَمْلُوکٍ مِنْ کَدِّ یَدِہٖ — حضرت امیرؑ نے ایک ہزار غلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے خرید کر آزاد کیئے۔

ظاہر ہے کہ ایک ہزار غلاموں کی خریداری کسی معمولی سرمایہ سے نہیں ہو سکتی۔ پھر کیا اب بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اپنے دست و پا کی کدوکاوش سے سرمایہ حاصل کرنا زہد و تقویٰ اور ترکِ دنیا کے خلاف ہے۔ امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں۔ کہ

کَانَ اَمِیرُ الْمُؤْمِنِینَؑ یَخْرُجُ فِی الْهَاجِرَةِ فِی الْحَاجَةِ قَدْ کَفِیَهَا یُرِیدُ اَنْ یَرَاهُ اللّٰهُ یُتْعِبُ نَفْسَهٗ — امیرالمومنینؑ اکثر دوپہر کے وقت ایسے کاموں کے لئے نکلتے تھے کہ اگر کسی اور سے فرما دیتے تو وہ ہو جاتے۔ لیکن

فی طَلَبِ الحَلَالِ — آپ چاہتے تھے کہ مال حلال کی طلب میں خود زحمت و مشقت اٹھائیں۔

آپ کے بعد بھی دیگر ائمہ معصومینؑ کی سیرت میں اس قسم کے نمونے موجود ہیں۔ عبد الاعلی مولی آل سام کا بیان ہے کہ ایک شدید گرمی کے دن میں میں نے امام جعفر صادقؑ کو مدینہ کے بعض کوچوں میں دیکھا فَقُلْتُ جُعِلْتُ فِدَاكَ حَالُكَ عِنْدَ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ وَقَرَابَتُكَ مِنْ رَسُولِ اللهِ وَاَنْتَ تَجْهَدُ نَفْسَكَ فِي مِثْلِ هٰذَا الْيَوْمِ میں نے عرض کیا کہ میری جان آپ پر نثار۔ آپ خدا کی بارگاہ میں جو قرب و منزلت اور رسالتمآبؐ سے جو اختصاص رکھتے ہیں وہ معلوم ہے۔ پھر باوجود اس کے آپ ایسے گرم وقت میں اتنی زحمت و مشقت اٹھا رہے ہیں؟ حضرت نے فرمایا:-

يَا عَبْدَ الْاَعْلٰى خَرَجْتُ فِي طَلَبِ الرِّزْقِ لِاَسْتَغْنِيَ بِهِ عَنْ مِثْلِكَ — میں تحصیل معاش کے لئے نکلا ہوں اس غرض سے کہ کسی کا محتاج نہ ہوں۔

ابو عمرو شیبانی کی روایت ہے:-

رَاَيْتُ اَبَا عَبْدِ اللهِ وَبِيَدِهِ مِسْحَاةٌ وَعَلَيْهِ اِزَارٌ غَلِيْظٌ يَعْمَلُ فِي حَائِطٍ لَهُ وَالْعَرَقُ يَتَصَابُّ عَنْ ظَهْرِهِ — میں نے امام جعفر صادقؑ کو دیکھا حضرت کے ہاتھ میں ایک بیلچہ ہے اور آپ موٹا لباس پہنے ہوئے اپنے ایک باغ میں مصروف کار ہیں۔ اور پسینہ حضرت

کی پشت سے ٹپک رہا ہے۔

فَقُلْتُ جُعِلْتُ فِدَاكَ اَعْطِنِي اَلْفَكَ

میں نے عرض کیا کہ یہ خدمت میرے سپرد ہو میں انجام دے دوں گا

حضرت نے فرمایا۔

اِنِّي اُحِبُّ اَنْ يَتَاذَى الرَّجُلُ بِحَرِّ الشَّمْسِ فِي طَلَبِ الْمَعِيشَةِ

مجھ کو اچھا معلوم ہوتا ہے کہ انسان دھوپ کی ایذا کو برداشت کرے اپنے معاش کی تلاش میں

فضل بن ابی قرہ کا بیان

دَخَلْنَا عَلَى اَبِي عَبْدِ اللّٰهِ فِي حَائِطٍ فَقُلْنَا لَهُ جَعَلَنَا اللّٰهُ فِدَاكَ دَعْنَا نَعْمَلْ لَكَ اَوْ تَعْمَلْهُ الْغِلْمَانُ قَالَ لَا دَعُونِي فَاِنِّي اَشْتَهِي اَنْ يَرَانِي اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ اَعْمَلُ بِيَدِي وَاَطْلُبُ الْحَلَالَ فِي اَذَى نَفْسِي

ہم امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے جب حضرت ایک باغ میں مشغول کار تھے ہم نے عرض کی کہ ہم کو اجازت دیجئے ہم اس کام کو کریں یا غلاموں کو حکم دیجئے حضرت نے فرمایا نہیں مجھ کو چھوڑ دو اسلئے کہ میں چاہتا ہوں کہ خداوند عالم کی نظر مجھ پر پڑے اس حالت میں کہ اپنے ہاتھ سے کام کرتا ہوں اور اپنے نفس کو ایذا پہنچا کر کسب حلال کرتا ہوں۔

درحقیقت یہ خیال کہ کسب معاش میں وقت صرف کرنا اور
اس سلسلہ میں کدو کاوش کرنا ترک دنیا کے خلاف ہے۔ اور زہد و
تقویٰ کے منافی ہے۔ اُس زمانہ میں بھی اکثر سطحی اور ظاہر بیں زہد و
تقویٰ کے حقیقی معیار سے ناواقف اور حقیقت کو مجاز میں محدود سمجھنے
والے افراد کے دل و دماغ میں موجود تھا اور اس کی صحت پر اتنا اعتماد
تھا کہ وہ اس سلسلہ میں امام پر اعتراض کر دینے کو بھی جائز سمجھتے تھے
جو اُن کی معرفت کی انتہائی کمزوری کی دلیل ہے۔ چنانچہ میں اسکی بہترین
سند محمد بن منکدر کے واقعہ کو سمجھتا ہوں۔ یہ بزرگ اپنے زمانہ
میں مشائخ اہل تصوف اور تارکین دنیا کی حیثیت میں سمجھے جاتے تھے
ان کا خود بیان ہے۔ کہ میں نے محمد بن علیؑ یعنی امام محمد باقرؑ کو دیکھا
فَاَرَدْتُ اَنْ اَعِظَهُ فَوَعَظَنِیْ میں نے یہ چاہا کہ حضرت کو موعظہ
و نصیحت کروں لیکن نتیجہ میں حضرت نے خود میری ہدایت فرمائی
فَقَالَ لَهُ اَصْحَابُهُ بِاَیِّ شَیْءٍ وَعَظَکَ۔ لوگوں نے پوچھا
کہ کیا واقعہ ہے؟ کیونکر انہوں نے آپ کی ہدایت فرمائی:۔

فَقَالَ خَرَجْتُ اِلٰی بَعْضِ نَوَاحِیْ	کہا میں بعض اطراف مدینہ میں ایک
الْمَدِیْنَةِ فِیْ سَاعَةٍ حَارَّةٍ	انتہائی گرم وقت میں کسی ضرورت
فَلَقِیَنِیْ اَبُوْ جَعْفَرٍ مُحَمَّدُ بْنُ	سے نکلا۔ راستہ میں مجھ کو امام محمد باقرؑ
عَلِیٍّ وَکَانَ رَجُلًا بَادِنًا	ملے اور حضرت ذرا تنومند اور جسیم تھے
ثَقِیْلًا وَهُوَ مُتَّکِیٌٔ عَلٰی غُلَامَیْنِ	اور اس وقت دو غلاموں کے

اَسْوَدَینِ اَوْ مُرْلَبِیْنِ فَقُلْتُ
فِیْ نَفْسِیْ سُبْحَانَ اللّٰہِ شَیْخٌ
مِنْ اَشْیَاخِ قُرَیْشٍ فِیْ ھٰذِہِ
السَّاعَۃِ عَلٰی مِثْلِ ھٰذِہِ
الْحَالَۃِ فِیْ طَلَبِ الدُّنْیَا
اَمَا اِنِّیْ لَاَعِظَنَّہٗ
فَدَنَوْتُ مِنْہُ فَسَلَّمْتُ عَلَیْہِ
فَرَدَّ عَلَیَّ بِنَھْرٍ وَھُوَ یَتَصَابُّ عَرَقًا

سہارے سے جا رہے تھے۔ میں
نے اپنے دل میں کہا۔ اللہ اکبر ایک
اتنا بڑا بزرگ مرتبہ شخص بزرگان قریش
میں سے اس وقت ایسی حالت میں
طلب دنیا میں مصروف ہے، تو سہی
جو میں ان کو اس وقت موعظہ کروں
میں حضرت کے قریب گیا اور سلام
کیا۔ حضرت نے سلام کا جواب دیا
اس حالت میں کہ سانس آپ کی
پھولی ہوئی تھی اور پسینہ ٹپک رہا تھا

فَقُلْتُ اَصْلَحَکَ اللّٰہُ شَیْخٌ مِنْ
اَشْیَاخِ قُرَیْشٍ فِیْ ھٰذِہِ السَّاعَۃِ
عَلٰی ھٰذِہِ الْحَالَۃِ فِیْ طَلَبِ
الدُّنْیَا اَرَاَیْتَ لَوْ جَاءَ
اَجَلُکَ وَاَنْتَ عَلٰی ھٰذِہِ
الْحَالِ

میں نے کہا کہ خدا آپ کے امور کی
اصلاح کرے۔ ایک بزرگ مرتبہ آدمی
بزرگان قریش میں سے اور وہ اس
وقت ایسی حالت میں دنیا طلبی میں
مصروف ہو؟ غور تو کیجئے۔ اگر ایسی
حالت میں آپ کو پیغام موت پہنچ
جائے تو کیا ہو گا۔

فَقَالَ لَوْ جَاءَنِیَ الْمَوْتُ وَاَنَا
عَلٰی ھٰذِہِ الْحَالِ جَاءَ فِیْ

حضرت نے فرمایا اگر مجھ کو موت
آئے اس حالت میں تو حرج کیا ہے

وَاَنَا فِی طَاعَۃٍ مِنْ طَاعَاتِ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ اَکُفُّ بِھَا نَفْسِی وَعِیَالِی عَنْکَ وَعَنِ النَّاسِ وَاِنَّمَا کُنْتُ اَخَافُ لَوْجَاءَنِی الْمَوْتُ وَاَنَا عَلٰی مَعْصِیَۃٍ مِنْ مَعَاصِی اللّٰہِ

اس لئے کہ اس صورت میں وہ موت مجھ کو آئی ہو گی اطاعت الٰہی میں مصروفیت کے عالم میں، جس کے ذریعہ سے میں اپنے کو اور اپنے اہل و عیال کو دوسروں سے بے نیاز کرنا چاہتا ہوں، بے شک ڈرتا تو میں اس وقت جب مجھ کو موت آتی ڈرتا تھا لیکہ میں کسی معصیت میں معاصی الٰہیہ سے مصروف ہوتا۔

فَقُلْتُ صَدَقْتَ یَرْحَمُکَ اللّٰہُ اَرَدْتُ اَنْ اَعِظَکَ فَوَعَظْتَنِی

میں نے کہا۔ آپ نے سچ فرمایا میں نے تو چاہا تھا آپ کو موعظہ کروں حقیقتاً آپ ہی نے مجھکو ہدایت فرمائی

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ترکِ دنیا کا معیار عام نظروں میں کیا تھا۔ اور امام نے اس کو کس طرح سے غلط ثابت کیا۔

اسی بناء پر برابر اپنے اصحاب کو کسبِ معیشت کی تاکید فرماتے رہتے تھے اور مخصوص طور سے تجارت کی طرف کہ جو تمام ذرائع کسب معیشت میں اہم درجہ رکھتی ہے۔ توجہ دلاتے رہتے تھے اور دلنشین الفاظ میں اس کے فوائد و منافع کو گوش گذار فرماتے تھے۔ چنانچہ امیر المومنین ؑ ارشاد فرماتے ہیں:۔

تَعَرَّضُوا لِلتِّجَارَةِ فَاِنَّ فِيْهَا غِنًى لَكُمْ عَمَّا فِي اَيْدِي النَّاسِ

تجارت کے لئے پیش قدمی کرو اس لئے کہ اس صورت میں تم دوسروں کے محتاج نہ رہو گے۔

اگر غور کیجئے تو امام نے اس مختصر جملہ میں تجارت کے تمام اقتصادی پہلوؤں پر روشنی ڈال دی ہے۔ اور جہاں تک غور کیا جائے اس میں بیش از بیش معانی مضمر نظر آتے ہیں۔

فضیل بن یسار کی روایت ہے:۔

قُلْتُ لِاَبِيْ عَبْدِ اللّٰهِ اِنِّيْ قَدْ كَفَفْتُ عَنِ التِّجَارَةِ وَاَمْسَكْتُ عَنْهَا قَالَ وَلِمَ ذٰلِكَ اَعَجْزٌ بِكَ كَذٰلِكَ تَذْهَبُ اَمْوَالُكُمْ

میں نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا کہ میں نے تجارت سے ہاتھ اٹھا لیا ہے۔ اور اسکو ترک کر دیا ہے حضرت نے فرمایا اور یہ کس لئے؟ کیا تم میں کمزوری پائی جاتی ہے؟ اس طرح تو تم لوگوں کے تمام اموال تمہارے ہاتھوں سے نکل جائیں گے۔

یہ مختصر فقرہ کہ "كَذٰلِكَ تَذْهَبُ اَمْوَالُكُمْ" تمام اس بیان کا لُب لباب اور جوہر اصلی ہے۔ جس کو میں نے مسلمانوں کے اقتصادی مرض میں طویل بیانات کے ساتھ واضح کیا ہے، وہی درآمد و برآمد کا سوال اور مسلمانوں کے داخلی سرمایۂ حیات یعنی اموال کا غیر اقوام کے پاس پہنچنا اور اسی طرح رفتہ رفتہ تمام موروثی و قدیمی نہفتہ و اندوختہ

سرمایوں کا ہمارے ہاتھ سے نکل کر دوسروں کے خزانوں میں چلا جانا یہی وہ ہے جس کو امام نے ترکِ تجارت کے نتیجہ میں ذکر فرمایا ہے

ترک تجارت کے مضر نتیجہ میں امام کا یہ ارشاد کہ اس طرح تمہارے اموال ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ اس کا قوی ثبوت ہے کہ افراد قوم کے پاس اموال کا ہونا اور دوسرے اقوام سے اموال کا محفوظ رہنا مذہبی تعلیمات کی رو سے قابلِ لحاظ اور ممدوح ومطلوب ہے۔ اور ترکِ دنیا کے مفہوم سے اس کو کوئی تضاد نہیں ہے

فضل بن ابی قرہ کی روایت ہے:۔

سَأَلَ اَبُوْعَبْدِ اللهِ عَنْ رَجُلٍ وَاَنَا حَاضِرٌ فَقَالَ مَا حَبَسَهُ عَنِ الْحَجِّ فَقِيْلَ تَرَكَ التِّجَارَةَ وَقَلَّ شَيْئُهُ، قَالَ وَكَانَ مُتَّكِئًا فَاسْتَوٰى جَالِسًا ثُمَّ قَالَ لَهُمْ لَاتَدَعُوا التِّجَارَةَ فَتَهُوْنُوْا اِتَّجِرُوْا بَارَكَ اللهُ لَكُمْ

امام جعفر صادقؑ نے ایک شخص کے متعلق دریافت فرمایا کہ وہ اب کی حج کو کیوں نہیں آیا۔ کسی نے کہا کہ اس نے تجارت ترک کر دی ہے اور اس کا سرمایہ بہت کم ہو گیا ہے۔ یہ سننا تھا کہ حضرت یا تو تکیہ سے لگے ہوئے بیٹھے تھے اور یا سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا دیکھو تم کبھی تجارت ترک نہ کرنا، ورنہ ذلیل ہو جاؤ گے۔ تجارت کرو، خدا برکت عطا فرمائے۔

بیشک عبرت حاصل کرنے کے قابل ہے یہ ارشاد :۔

لَاتَدَعُوا التِّجَارَةَ فَتَهُونُوا

تجارت نہ چھوڑنا ۔ ورنہ ذلیل ہو جاؤ گے ۔

بیشک یہی وہ منظر ہے ۔ جس کو ہم آنکھ سے دیکھ رہے ہیں مسلمان اب اقوام عالم کی نظروں میں ذلیل ہیں اور کیوں ؟ اسی لیئے ۔ کہ اسلامی تعلیمات پر عمل نہ کیا ، تجارت کو ترک کر دیا ۔ جس پر اُن کی حیات قومی کا دارو مدار تھا ۔

اسباط بن سالم کی روایت :۔

دَخَلْتُ عَلٰی اَبِیْ عَبْدِ اللّٰہِ ؑ فَسَأَلَنَا عَنْ عُمَرَ بْنِ مُسْلِمٍ مَا فَعَلَ فَقُلْتُ صَالِحٌ وَلٰکِنَّہٗ قَدْ تَرَکَ التِّجَارَةَ فَقَالَ اَبُوْ عَبْدِ اللّٰہِ عَمَلُ الشَّیْطَانِ ثَلٰثًا اَمَا عَلِمَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ اشْتَرٰی عِیْرًا اَتَتْ مِنَ الشَّامِ فَاسْتَفْضَلَ فِیْہَا مَا قَضٰی دَیْنَہٗ وَقَسَمَ فِیْ قَرَابَتِہٖ یَقُوْلُ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ رِجَالٌ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰہِ اِلٰی اٰخِرِ الْاٰیَةِ

میں امام جعفر صادق ؑ کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ حضرت نے ہم سے عمر بن مسلم کے متعلق دریافت فرمایا ۔ کہ وہ کیا کرتے ہیں ؟ میں نے کہا اچھے ہیں مگر انہوں نے تجارت کو ترک کر دیا یہ سن کر حضرت نے تین بار فرمایا کہ یہ شیطانی طرز عمل ہے ۔ کیا اس کو نہیں معلوم کہ رسالت مآب ؐ نے شام سے آئے ہوئے مال تجارت کو خرید فرمایا اور اس میں فروخت کے بعد اتنا نفع حاصل کر لیا ۔ کہ اپنے

يَقُولُ الْقُصَّاصُ اَنَّ الْقَوْمَ يَكُونُوا يَتَّجِرُونَ كَذَبُوا وَلٰكِنَّهُمْ لَمْ يَكُونُوا يَدَعُونَ الصَّلٰوةَ فِي مِيقَاتِهَا وَهُوَ اَفْضَلُ مِمَّنْ حَضَرَ الصَّلٰوةَ وَلَمْ يَتَّجِر

قرضہ کو ادا کیا اور اپنے اعزہ کی اعانت فرمائی۔ خداوند عالم نے کچھ لوگوں کی مدح کرتے ہوئے ارشاد کیا ہے۔ وہ لوگ۔ ایسے ہیں جن کو تجارت اور بیع ذکر خدا سے غافل نہیں کرتی۔ عام افسانہ گویوں کا خیال ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو تجارت نہ کرتے تھے۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ بلکہ یہ لوگ تجارت کرتے تھے۔ اور پھر بھی نماز کو اس کے اوقات میں ادا کرنے کے پابند تھے۔ اور یہ افضل ہیں۔ اُن لوگوں سے جو نماز میں شریک ہوتے تھے۔ مگر تجارت نہ کرتے تھے:

اس حدیث سے جس طرح یہ ظاہر ہے کہ ترکِ تجارت عملِ شیطانی کہنے کا مستحق سمجھا گیا ہے۔ اسی طرح تجارت میں مشغولیت کی حد افراط و تفریط کا بھی پتہ لگ گیا۔ تجارت میں مصروفیت اس قدر کہ فرائض الٰہیہ میں فرو گذاشت ہو۔ اس کا مذموم پہلو ہے۔ جس طرح تجارت کا ترک کر دینا اگرچہ عبادات الٰہیہ میں مصروفیت کی جہت سے ہو، قابلِ مدح صفت نہیں۔ بلکہ انسان تجارت کے ساتھ ساتھ فرائض الٰہیہ

کی بجاآوری کا خیال رکھے تو یہ اس کی کامیابی اور قابلِ مدح زندگی کہی

جا سکتی ہے۔

اب غالباً اس خیال کی کوئی گنجائش نہیں رہی کہ کسبِ حلال اور طلبِ معیشت وغیرہ میں مصروفیت ترکِ دنیا کے خلاف یا زہد وتقوےٰ کے منافی ہے۔ لیکن زیادتی اطمینان کے لئے یہ دو حدیثیں بھی نذرِ ناظرین ہیں۔ جن میں صریحی طور سے زہد کا معیار بتلا دیا گیا ہے

ملاحظہ ہو سکونی کی روایت امام جعفر صادقؑ سے :-

قُلْتُ لَهُ مَا الزُّهْدُ فِي الدُّنْيَا قَالَ وَيْحَكَ حَرَامُهَا فَتَنَكَّبْهُ

میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ زہد فی الدنیا کے معنی کیا ہیں۔ حضرت نے فرمایا۔ یعنی دنیا کا مالِ حرام، اس سے اجتناب کرو۔

دوسری حدیث اسمٰعیل بن مسلم کی روایت :-

قَالَ أَبُو عَبْدِ اللهِ لَيْسَ الزُّهْدُ فِي الدُّنْيَا بِإِضَاعَةِ الْمَالِ وَلَا تَحْرِيمِ الْحَلَالِ بَلِ الزُّهْدُ فِي الدُّنْيَا أَنْ لَا تَكُونَ بِمَا فِي يَدِكَ أَوْثَقَ مِنْكَ بِمَا عِنْدَ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ

زہد فی الدنیا کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان خواہ مخواہ مالِ دنیا کو اپنے ہاتھ سے جانے دے اور حلال کو بھی اپنے اوپر حرام سمجھ لے۔ بلکہ زہد یہ ہے کہ انسان دنیاوی اموال پر اتنا اعتماد نہ کرے کہ آخرت کے معاملہ میں کوتاہی کرنے لگ

اس سے صاف ظاہر ہے کہ کسب حلال اور جائز ذرائع سے طلب معیشت کسی طرح زہد و تقوےٰ کے خلاف نہیں ہے۔ اور نہ وہ شریعت اسلامی کے اعتبار سے کسی طرح قابلِ اعتراض سمجھا جاسکتا ہے۔

ترکِ دُنیا کا روشن پہلو

امیر المومنینؑ کے ترکِ دُنیا کی نوعیّت

دُنیا کو تین مرتبہ طلاق دینے کا صحیح مفہوم

اب تک جو کچھ بھی کہا گیا وہ اس خیال کا دفعیہ تھا کہ انسان کا کسبِ معاش میں کوشش اور تحصیل مال میں جد و جہد کرنا اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ ہم نے مکمل طور سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچا دیا کہ اسلام ہرگز دنیاوی اموال کی تحصیل اور کسبِ معاش میں کوشش کو جائز طریقوں سے ہو مذموم نظر سے نہیں دیکھتا بلکہ وہ جس طرح انسان کے لئے اپنی آخروی زندگی کے لئے سامان فراہم کرنے کو اہم فرائض قرار دیتا ہے۔ اسی طرح اپنی انفرادی و اجتماعی دنیاوی زندگی میں بھی سعی و کوشش کو انسان کے فرائض میں داخل

کرتا ہے۔ لیکن اب دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ انسان اموال کی جمع آوری اور ذرائع کسب معاش سے سرمایہ کی فراہمی کے بعد اس کو کرے کیا؟ ایک صورت یہ ہے کہ انسان اموال دنیا کو جمع کرے۔ سرمایہ شخصی کی فراوانی میں انتہائی جدوجہد صرف کرے۔ طلاء و نقرہ کے انبار لگائے اور زر و جواہر سے خزانے پُر کرے۔ لیکن اس کی منفعت اس کی ذات تک محدود رہے۔ اس کے جسم پر بہتر سے بہتر لباس ہو اس کے دسترخوان پر لذیذ سے لذیذ غذائیں ہوں، اس کے دروازہ پر حشم و خدم ہو، اس کے گردا گرد خدام و ملازمین کا ہجوم ہو۔ اس کی زندگی شاہانہ اور اس کا ساز و سامان ملوکانہ ہو اور اس کے بعد بھی جو کچھ باقی رہے وہ صندوقوں میں مقفّل اور خزانے کے بند دروازوں میں محفوظ حیات کے آخری لمحوں تک ہر کس و ناکس کی نگاہ سے پوشیدہ و مستور باقی رہے۔ لیکن نہ اس سے خلق خدا کو کوئی فائدہ پہنچے نہ قومی و مذہبی امور پر اس کے احسانات کا بار پڑے اور نہ کسی غیر تک اس فیض کا اثر پہنچے۔ یہ ہے افسوسناک سرمایہ داری جس میں اکثر و بیشتر ارباب دولت و اقتدار مبتلا نظر آتے ہیں۔ ایسے افراد جتنی تعداد میں بھی ہو جائیں کبھی قومی ترقی کا باعث نہیں ہو سکتے۔ ان کی ترقی ہمیشہ انفرادی ہوگی۔ جس کا قوم کے نظام اجتماعی پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ اس کے بالکل برخلاف دوسری صورت یہ ہے کہ انسان اموال کی جمع آوری کرے۔ کسب معاش

میں زحمت اٹھائے لیکن اپنے حاصل کردہ اموال کو صرف اپنی ذات پر صرف کرنے کے بجائے وہ فقراء و مساکین کی خبر گیری کرے۔ قومی و مذہبی کاموں کی انجام دہی کرے۔ اور خیر و خیرات، اوقاف و صدقات کے ذریعہ سے اپنے قومی نظام اجتماعی کے ترقی دینے میں مصروف رہے اس کا لباس فقیرانہ ہو۔ اس کا طعام گدایانہ ہو۔ اس کا طرز زندگی محتاجانہ ہو، لیکن اس کے ہاتھوں سے بھوکوں کو کھانا پہنچتا ہو۔ فقیروں کو لباس ملتا ہو اور محتاجوں کو ان کی زندگی کا سامان مہیا ہوتا ہو۔

بیشک یہ ہے ترک دنیا کا روشن پہلو جس کی تفسیر یہ ہے کہ انسان دنیا کو اپنی ذات پر صرف نہ کرے۔ مگر اس قدر کہ جو اس کی زندگی کے لئے کم سے کم مقدار میں ضروری ہو۔ اور باقی سب خلق اللہ کی بہبودی و منفعت رسانی میں صرف کر دے۔ یہ ترک دنیا اجتماعی ترقی کا کامیاب ذریعہ اور نظام اجتماعی کا شیرازہ محکم ہے ایسے تارک دنیا اشخاص کا وجود باعثِ پستی نہیں بلکہ قوم کو بلند سے بلند معراج ترقی پر پہنچانے کا ضامن ہے۔

اکثر باتیں ایسی ہوتی ہیں جو نتیجۃً متحد ہیں۔ لیکن صورت و نوعیت اور اسباب و مقدمات کی بنا پر ان میں ممدوح و مذموم ہونے کی حیثیت سے تفرقہ ہو جاتا ہے۔ پھٹا ہوا لباس، روکھی سوکھی روٹی، احتیاجی و بے سر و سامانی ایک چیز ہے۔ لیکن یہ کبھی بیکاری و کاہلی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ کہ انسان ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہا

دنیا میں کوئی کام ہی نہ کیا۔ اور نہ کبھی تحصیل معیشت میں کوشش کی جس
کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دوسروں کا دست نگر و محتاج رہا اور نکبت و
افلاس کی بلا میں گرفتار رہا، یہ محتاجی و بے سروسامانی کبھی مدح و
ثنا کے قابل نہیں سمجھی جاتی اور نہ وہ تحسین و آفرین کی مستحق ہے۔ اس
صورت سے محتاج رہنے والا خدا کی دی ہوئی نعمت کے کفران اور
اس کی عطا کی ہوئی طاقتوں کی ناقدرشناسی کا مرتکب ہے۔ اور اگر
ترکِ دنیا کا یہ مفہوم سمجھا جاتا ہے تو وہ غلط ہے۔ اور اسلامی تعلیمات
کے خلاف۔ لیکن کبھی یہ بے سروسامانی و پریشانی اس امر کا نتیجہ
ہے کہ انسان نے تحصیلِ معاش میں جد وجہد اور کسبِ معیشت میں
کد و کاوش کی، اور کرتا ہے۔ اور اس میں کامیاب بھی ہوا۔ لیکن جو
کچھ ملتا ہے اس کو اپنی ذات پر صرف کرنے کے بجائے دوسروں پر
صرف کرتا ہے۔ خود بھوکا رہتا ہے۔ لیکن دوسروں کا پیٹ بھرتا
ہے۔ خود پھٹے کپڑے پہنتا ہے۔ لیکن بہتیروں کو لباس پہنا دیتا
ہے۔ خود فقیروں کی زندگی بسر کرتا ہے۔ لیکن کتنے فقراء کی زندگی
کا سامان کر دیتا ہے۔ یہ فقر و فاقہ اور پریشان حالی وہ ہے۔ جو روح
عزت اور جوہر کمال ہے۔ اس کا نام ہے ایثار، اس کا نام ہے
مواسات۔ وہ پھٹا ہوا لباس شاہوں کے تاج سے زیادہ وقیع اور
سوکھی روٹی سلاطین کے خوانِ نعمت سے زائد باوقار ہے۔ اور
اس فقر و فاقہ میں وہ جاہ و جلال ہے

و اہل ثروت و سرمایہ کو نصیب نہیں۔

یہ ترکِ دنیا وہ ہے جس کو مکمل صورت سے امیرالمومنین علی ابن ابی طالب نے پیش کیا تھا۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھے تھے۔ انہوں نے اموالِ دنیا کے حاصل کرنے اور کسبِ معیشت میں کد و کاوش کو ترک نہیں کیا تھا۔ انہوں نے اپنے دست و بازو اور قوت و طاقت کو بیکار نہیں رکھا تھا، لیکن اس مال کو انہوں نے کیا کیا؟ خود فاقوں پر فاقے کئے، پھٹا ہوا پیوند دار لباس پہنا، فقراء کی سی زندگی بسر کی، لیکن مظلوموں کی گلو خلاصی کی۔ فقراء کی خبر گیری اور غرباء کو منفعت رسانی فرمائی۔ ان کے متعلق یہ حدیث سابق میں گزر چکی ہے۔ کہ

اِنَّ اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَعْتَقَ اَلْفَ مَمْلُوْکٍ مِنْ کَدِّ یَدِہٖ	امیرالمومنینؑ نے ایک ہزار غلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے خرید کر آزاد کئے۔

اگر وہ چاہتے تو اپنے لئے اسی سرمایہ سے عمدہ مکان بنوا لیتے اچھے اچھے لباس تیار کراتے اور لذیذ کھانے کھاتے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ ان کا معیارِ نظر اس سے بہت بلند تھا۔ انہوں نے دنیاوی لذائذ سے خود متمتع ہونا کبھی گوارا نہ کیا۔ اور نہ سونے چاندی کے انبار لگا کر خزانوں کا منہ بھرا۔ ان کا قول تھا۔ کہ

یا صفراء یا بیضاء غری غیری

اے سنہرے روپہلے دل لبھانے والو سکو، کسی اور کو جا کر فریب دو مجھ پر تمہارا جادو نہیں چل سکتا۔

ان کا ارشاد تھا:۔

طَلَّقْتُكِ ثَلَاثًا لَا رَجْعَةَ بَعْدَهَا

اے دنیا میں نے تجھ کو تین مرتبہ طلاق دیا ہے۔ جس کے بعد رجوع ممکن نہیں۔

ہر زبان کے کچھ محاورات ہوتے ہیں۔ اور وہ اکثر و بیشتر مجاز یا کنایہ پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان میں حقیقت کے تمام خواص و لوازم کا تلاش کرنا ان کے اصلی مفاد سے علیحدہ ہو جانے کا مرادف ہے۔ کسی کی اولاد جاتی ہے تو وہ کہتا ہے میری تمام عمر کی کھیتی برباد ہو گئی۔ اب کیا اس سے دریافت کیا جائے گا۔ کہ کھیتی کہاں تھی؟ وہ کس زمین پر تھی اور اس میں پانی کس طرح دیا جاتا تھا۔ اور جو کچھ کھیتی کے لوازم ہیں وہ اس میں کب موجود تھے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ کھیتی برباد ہونا صرف اسی اعتبار سے ہے کہ تربیت اور نشو و نما کے حصول میں محنت کی گئی اور وہ ضائع ہو گئی کبھی کہتا ہے کہ میرا چراغ گل ہو گیا۔" اب کیا اس سے یہ سمجھا جائے گا کہ چراغ دن کو خاموش اور رات کو روشن کیا جاتا ہے۔ تو وہ فرزند بھی اسی صورت سے دن کو مخفی رات

کو ظاہر رہتا تھا"

حسین چہرہ کی تشبیہ آفتاب سے صحیح ہے۔ لیکن اس کے رہنے کے لئے چرخ چہارم کی ضرورت نہیں۔ اور رخسار کی تعبیر گلاب سے درست ہے۔ مگر اس میں خوشبو کے تلاش کی حاجت نہیں ہے۔

امیرالمومنین کا یہ ارشاد کہ:-

طَلَّقْتُكِ ثَلٰثًا لَا رَجْعَةَ بَعْدَهَا "میں نے دنیا کو تین مرتبہ طلاق دیا۔ جس کے بعد رجوع نہیں"

حقیقی اعتبار سے تو ہے نہیں، اس لئے کہ طلاق عورت سے مخصوص ہے۔ جو بطریق عقد دائم انسان کی زوجیت میں داخل ہوئی ہو اور یہ ظاہر ہے کہ دنیا نہ کوئی مجسمہ ہستی ہے۔ نہ وہ نوعِ انسانی کی کسی صنف میں داخل ہے، جو عورت کہی جا سکے اور اس سے تعلقات ازدواج کا قطع کرنا حقیقی معنی میں طلاق ہو۔ بلکہ یہ صرف استعارہ کی صورت سے ارشاد ہوا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح وہ عورت جس کو تین مرتبہ طلاق دیا جا چکا ہو۔ انسان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہوتی ہے۔ اور کبھی ان میں تعلقات قائم نہیں ہوتے۔ اسی طرح مجھ کو تجھ سے ایسی بے تعلقی ہے۔ جو تغیر و تبدل کے قابل نہیں ہے۔

اب یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ طلاق اس وقت صحیح ہے جب انسان تعلقات ازدواج رکھتا ہو تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ

امیرالمومنینؑ کا، دامن کبھی دنیا سے ملوّث ہوا تھا۔ نیز طلاق بائن ہمارے
مذہب کی بنیاد پر اس وقت ہوتا ہے۔ جب ایک مرتبہ طلاق
دے کر پھر رجوع کرے اور پھر طلاق دے اور پھر رجوع کرے
اسی صورت سے جب تیسری مرتبہ طلاق دے تو پھر وہ عورت
بائن ہو جاتی ہے۔ تو کیا امیرالمومنینؑ کے طرز عمل میں بھی دنیا کے
ساتھ یہ انقلابات و تغیرات ہوتے رہے۔ اس کے علاوہ اس
دنیا سے مراد اگر دنیائے ممدوح ہے تو اس کو طلاق دینے کے
کیا معنی؟ اور اگر دنیائے مذموم ہے تو اس سے ملوث ہونے کا کیا
موقع تھا جو طلاق کی ضرورت ہوتی؟

ان تمام خیالات کی بنیاد اسی پر ہے کہ طلاق کے مفہوم کو حقیقی
معنی میں سمجھ کر اس کے تمام لوازم کی جستجو کی جائے لیکن حقیقت
امر جیسا کہ ہم نے بیان کیا اس طرح نہیں ہے بلکہ اپنی کامل
بے تعلقی کی تشبیہ مطلقہ ثلاث یعنی تین مرتبہ طلاق دادہ شدہ
عورت سے ہمیشہ کے قطع تعلق کے ساتھ دیا منظور ہے جس
میں وجہ مشترک اور سبب مشابہت آئندہ کی بے تعلقی ہے نہ سابق
کے تعلقات۔

اب یہ بے تعلقی ہے کس وقت سے؟ اس کی تو تحدید
نہیں کی گئی ہے اور نہ یہ کہا گیا کہ اب میں تجھ کو طلاق دیتا ہوں۔ تاکہ
شبہ پیدا ہو سکے۔ قبل کے تعلقات کا۔ بلکہ ارشاد کیا

طَلَّقْتُكِ ثَلٰثًا میں تجھ کو طلاق دے چکا ہوں - یعنی اتنی بے تعلقی کر چکا ہوں جو تین مرتبہ طلاق دینے سے پیدا ہو سکتی ہے -

اب یہ سمجھنے کا حق باقی ہے کہ اس بے تعلقی کی ابتداء ابتدائے فطرت اور آغاز تخلیق سے شروع ہوتی ہے - لہٰذا اس کے لئے کسی خاص زمانہ کی حد مقرر کرنا صحیح نہیں ہے -

یہ تھا وہ ترکِ دنیا جس کو امیر المومنینؑ نے کیا تھا - لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہ تھے کہ مال دنیا کی تحصیل اور کسب معیشت کی جدوجہد ہی ناقابل معافی الزام اور مستوجب مذمت جرم ہے بیشک طلبِ دنیا اگر صرف ذاتی منفعت رسانی و لذت کشی و خودستائی کے لئے ہے تو وہ قابل نفرت سرمایہ داری ہے - مگر جب وہ خلق خدا کی بہبودی اور منفعت نوعی کے لئے ہو تو وہ قابل مدح وستائش ہے - اور اس پر واضح الفاظ میں معصوم نے روشنی ڈالی ہے - جب کسی شخص نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا

وَاللّٰهِ اِنَّا لَنَطْلُبُ الدُّنْیَا وَنُحِبُّ اَنْ نُؤْتَاهَا

بخدا ہم میں دنیا طلبی پائی جاتی ہے اور ہمارا دل چاہتا ہے کہ دنیا ہمارے ہاتھ آئے -

حضرت نے فرمایا :-

تُحِبُّ اَنْ تَصْنَعَ بِهَا مَاذَا

یہ تو بتلاؤ کہ تم دنیا کو حاصل کر کے کیا کرنا چاہتے ہو -

قَالَ اَعُوْدُ بِهَا عَلٰی نَفْسِیْ وَ عِیَالِیْ وَاَتَصَدَّقُ بِهَا وَاَحُجُّ وَاَعْتَمِرُ

عرض کیا۔ یہی کہ دنیا کو حاصل کر کے اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لیے اسباب زندگی مہیا کروں اور لوگوں کو خیرات دوں، اور حج وعمرہ بجالاؤں

حضرت نے فرمایا:۔

لَیْسَ هٰذَا طَلَبُ الدُّنْیَا هٰذَا طَلَبُ الْاٰخِرَةِ

پھر یہ تو دنیا طلبی نہ ہوئی۔ بلکہ یہ حقیقتاً آخرت کی طلب ہے۔

اب بھی کیا زیر بحث مسئلہ میں کوئی گنجلک باقی رہ گئی؟ کیا یہ خیال اب حق بجانب سمجھا جا سکتا ہے کہ طلب معیشت میں کوشش اور تحصیل مال حلال میں جد وجہد ہی ترک دنیا کے منافی اور اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ کیا اس امر میں کوئی شبہ باقی رہ گیا کہ اسلام اس صورت سے جو عام طور پر سمجھی جاتی ہے ترک دنیا کا حامی نہیں ہے۔ بلکہ اس طرح کا ترک دنیا نظام اجتماعی اور مفاد ملی اور مصالح قومی کے ساتھ سخت ترین دشمنی اور بے انصافی ہے جس کی اسلام کبھی اجازت نہیں دیتا۔

دوسرا خیال اور اس کا دفعیہ
مسئلہ تقدیر کا حل

اور

خدا کو رازق سمجھ کر کسبِ معاش کو غیر ضروری سمجھ لینے کا ابطال

ایک دوسرا خیال جو بہ اعتبار اپنے نتائج اور مضر اثرات کے پہلے خیال سے زیادہ ہلاک اور سمیت آمیز ہے۔ لیکن اکثر دماغوں میں راسخ ہے۔ وہ یہ ہے کہ دنیاوی حوادث اور انسانی حالات کا تغیر و تبدل قضا و قدر الٰہی کا پابند ہے اور جو کچھ تقدیر میں ہے وہ ہو کر رہے گا۔ اور اسی تقدیر پر جو مشیتِ باری کا نتیجہ ہے مستقبل کا دارومدار ہے۔ تو اب انسان جدوجہد کرے، دست و پا کو حرکت دے، میدانِ عمل میں سعی و کوشش کرے۔ یا یہ کچھ نہ کرے۔ بہرحال جو کچھ ہونے والا ہے۔ اس کے لئے وہ ہوگا۔ تو پھر اس تمام کد و کاوش کی ضرورت اور سعی کی حاجت؟ کچھ بھی نہیں۔ بلکہ انسان خدا کی مشیت سے لو لگائے بیٹھا رہے۔ اور جو کچھ اس کی جانب سے ہو اچھا ہو یا برا اس کا بہ کشادہ پیشانی استقبال

کرے مخصوص طلبِ معیشت وغیرہ کے متعلق اس خیال کو دوسری لفظوں میں یوں پیش کیا جاتا ہے کہ خدا رازق ہے اور اس نے ہر ذی روح کے لیئے رزق مقرّر فرما دیا ہے، وہ رزق ملے گا ضرور خواہ انسان جد وجہد، سعی وعمل کرے یا نہ کرے۔

تو اب دکانداری، پیشہ وری، کاشتکاری، دستکاری وغیرہ وغیرہ جتنے ذرائع کسبِ معیشت ہوں، سب بے نتیجہ اور عبث ہیں کیونکہ وہ نہ مقررہ رزق میں زیادتی کر سکتے ہیں اور نہ انسان کا صبر وسکون اور خاموشی۔ اور ان ذرائع سے کنارہ کش ہونا، اس میں کمی پیدا کر سکتا ہے، وہ رازق ہے اور جب وہ رازق ہے تو رزق عطا کرے گا ضرور، انسان اسی پر اعتماد کیئے بیٹھا رہے اور یہی معنی ہیں توکّل کے، جو مذہبی تعلیمات میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔

یہ ہے وہ خیال جو اکثر خوش عقیدہ اور پاک طینت لیکن سادہ لوح مسلمانوں کے ذہن میں قائم ہو گیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ بھی حقیقتاً معرفت قضاء وقدر اور مذہبی معارف وتعلیمات سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔

مذکورہ بالا نظریہ یا خیال کے متعلق سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ یہ افراد خود اپنے دورِ حیات اور نظامِ زندگی میں کسب معاش کے علاوہ دوسرے شعبوں میں اس عقیدہ پر کہاں تک عامل نظر آتے

ہیں۔ اور اس سے معلوم ہو گا کہ وہ افراد جو اس عقیدہ کے داعی و مبلغ ہیں خود اپنی عملی زندگی میں اس کی مخالفت پر مجبور ہیں۔ "جو کچھ ہونا ہے وہ ہو گا۔ لہٰذا انسان کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں" اگر کلیہ کے طور پر بالکل صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کو کسی مقصد کے حصول میں کسی قسم کی بھی جد وجہد حق بجانب اور ضروری نہ ہو۔ مریض مبتلائے مرض ہو اور تیماردار خواب استراحت میں رہے۔ طبیب کی طرف رجوع اور مرض کی تشخیص اور نسخہ کی تجویز اور دوا کے استعمال کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ جو کچھ ہونا ہے وہ تو ہو وے ہی گا۔

سامنے سے شیر کے ہمہمہ کی آواز اور اس کی آمد اور انسان فرار کرنے پر قادر لیکن ہاتھ پاؤں کو حرکت نہ دے۔ اس لئے کہ جو کچھ تقدیر میں ہے وہی ہو گا۔ بھوک کی شدت اور سامانِ غذا گھر میں موجود۔ لیکن اٹھ کر پکانا، سامنے لانا، ہاتھ کو گردش دینا اور لقموں کو دہن تک لے جانا سب بے کار۔ اس لئے کہ اگر سیر ہونا مقدر میں ہے تو ضرور ہو گا۔ اور پھر خدا رازق ہے رزق پہنچائے گا ضرور۔ ہاتھ پیروں کو حرکت دینے کی ضرورت؟ کسی مقصد کے لئے پہنچنا ضروری۔ مثلاً واعظ کی تقریر سننے کا اشتیاق، لیکن کپڑے پہننا، گھر سے نکلنا، قدم قدم رستہ قطع کرنا یہاں تک کہ جلسہ میں جا کر بیٹھنا اور زحمت گوارا کرنا سب فضول

ہی ہے کہ تقریر کی ساعت ہونا ہے تو ہوگی۔ اس تمام جدوجہد کی ضرورت کیا؟

بے شک اگر ہر چیز قضاء و قدر کی بنا، پر اس طرح ہوتی ہے کہ انسانی جدوجہد کے ہونے نہ ہونے کو اس میں دخل نہیں تو اس میں یہ اور ان کے ایسے ہزاروں نتائج پیدا ہونا ناگزیر ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ مذکورۂ بالا صورت عالم انسانی کے ہر جزو و کل کی سیرت زندگی اور طرز عمل کے خلاف ہے۔ وہی لوگ جو بلند بانگ آواز سے قضاء و قدر الٰہی کا نام لے کر اپنے کو طلب حلال اور کسب معیشت کے فرائض سے سبکدوش بنانا چاہتے ہیں وہ بھی دوسرے زندگی کے شعبوں میں اس کلیہ پر قائم نہیں رہتے، کوئی بیمار ہوتا ہے تو اس کا علاج کرتے ہیں، بھوک لگتی ہے تو کھانا پکواتے ہیں اور کھاتے ہیں، کوئی ضرورت ہوتی ہے تو خود راستہ قطع کرتے ہیں اور اس جگہ جاتے ہیں۔ کوئی دشمن حملہ کرتا ہے تو مدافعت کرتے ہیں۔ غرض ہر شے کے لئے جو اس کے اسباب ہیں ان کو خود اپنی عملی جدوجہد سے مہیا کرتے ہیں۔ اور یہ نہیں کہتے کہ ہم کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں، جو ہونا ہے وہ ہوگا۔ لیکن ادھر کسبِ معاش کا مسئلہ پیش ہوا اور بڑے خدا پرست ذلوکل پیشہ بن کر فرمانے لگے کہ جتنا مقدر میں ہے وہ خدا دیگا ضرور، محنت کریں یا نہ کریں۔

کیا اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ صرف بیکاری کی زندگی اور طلب معیشت میں عاجزی و درماندگی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے یہ ایک بہانہ ہے جو مذہبی عقیدہ کی صورت میں پیش کیا جارہا ہے ورنہ اگر عقیدہ پر سچا ایمان ہوتا تو اس کا اثر زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی ضرور نظر آتا۔ اب مجھ کو یہ دیکھنا ہے کہ حقیقتاً یہ خیال قضا و قدر کے مسئلہ کے تحت میں صحیح بھی ہے یا نہیں؟

بے شک قضا و قدر حق ہے اور عالم تکوین کا ہر حادثہ قرارداد الٰہی کا پابند ہے اور یقیناً جو شے جس صورت سے مقدر ہو اسی صورت سے انجام پذیر ہونا ضروری ہے۔ لیکن دیکھنا اس بات کا ہے کہ قضا و قدر الٰہی جاری کس طرح پر ہوتی ہے۔ اور قرارداد باری کی نوعیت کیا ہے اور تقدیر کس صورت پر قائم ہوتی ہے۔ جس طرح اور جس نوعیت میں اور جس صورت پر قضا و قدر کا نفاذ ہوا ہے وہی ہو کر رہے گا اور اس میں تغیر و تبدل ناممکن ہے۔ عالم امکان اور دنیا کے مقررہ نظام کا جب جائزہ لیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد ذرائع و اسباب پر قرار دی گئی ہے۔ اور بغیر کسی غیر معمولی مصلحت کے جو اعجاز و کرامت کا باعث ہو اس اصول کی مخالفت نہیں ہوا کرتی۔ ابر آئے تو پانی برستا ہے، آفتاب آفتاب طالع ہو تو دھوپ نکلتی ہے۔ آگ ہو تو شعلے اٹھتے ہیں۔ پانی ہو تو آگ بجھتی ہے۔ پیاس بجھانے کے لئے پانی پینے کی

ضرورت اور بھوک جانے کے لئے کھانا کھانے کی حاجت ہے، جو شخص پہاڑ سے ٹکر لگائے پاش پاش ہو گا۔ آگ میں پھاندے جل کر خاک ہو گا۔ سنکھیا کھالے ہلاک ہو گا۔ سمندر میں پھاند پڑے غرق ہو گا۔ غرض جیسے اسباب و ذرائع مہیا ہوں ویسا نتیجہ برآمد ہو گا اور درحقیقت کسی شئے کے اچھے بُرے نتائج ظاہر ہونیکی ذمہ داری انسان پر ان ہی اسباب و ذرائع سے عائد ہوتی ہے۔ جو ان نتائج کے موجب ہیں اگرچہ خود وہ نتائج انسان سے مجبوری اور بے بسی کے عالم میں نمودار ہوں، لیکن وہ اس کے ہاتھوں ہوتے ہیں اس اعتبار سے کہ وہ ان کے اسباب کا ذمہ دار ہے۔

بندوق کا رخ کسی کی طرف کر کے فیر کرنے والا اس کا قاتل ہے حالانکہ روح و بدن کا افتراق نفس کی آمدوشد کا انقطاع، حرکت قلب کا رُکنا اور دم کا نکلنا اس کے ہاتھ کا کام نہ تھا۔ اور گولی کا پڑنا اس کا در آنا اور سینہ توڑ کر نکل جانا بھی اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اور نہ جب وہ گولی ہوا کے دامن میں اور قضا کی آغوش میں پوری قوت کے ساتھ جا رہی تھی تو یہ اس کے روکنے پر قادر تھا۔ لیکن پھر بھی قاتل یہ ہے اس لئے کہ بندوق کا رُخ اس طرف کر کے اس انداز کی تحریک جس کا نام ہے فیر اس کا کام تھا اور اختیاری کام، اس لئے آخر تک جتنے نتائج ہوں وہ اسی کے دست و بازو کا کرشمہ ہیں۔

انسان کی کسی خاص نتیجہ پر تعریف یا مذمت بھی ان ہی اسباب کی بنا پر ہوتی ہے۔ جنہیں وہ باختیار خود فراہم کرتا ہے۔ بلاشبہ غیر معمولی حوادث کبھی نتیجہ کو انسان کے مزعومہ اسباب وذرائع سے علیحدہ بھی کرتے ہیں۔ جس کا کبھی تو یہ باعث ہوتا ہے کہ انسان کی نظر نے اسباب کی تشخیص میں غلطی کی اور جس کو وہ سبب سمجھتا تھا حقیقتاً سبب ہی نہ تھا فریب نظر تھا اور سراب خیال۔ لہٰذا اسباب و مسببات کے فلسفہ کا قدرتی تقاضا ہی یہ تھا۔ کہ وہ نتیجہ حاصل نہ ہو، اور کبھی انسان اسباب مہیا کرتا ہے اور ٹھیک ترتیب سے لیکن قدرت کی طرف سے کوئی غیر معمولی مانع پیدا کر دیا جاتا ہے جو اُن اسباب کی کامیابی میں سدّراہ ہو جاتا ہے۔ یہ کامیابی و عدم کامیابی انسان کے بس کی بات نہیں اور نہ وہ اس کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ لیکن اس کی ذمہ داری اسباب وذرائع کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ اور اسی پر وہ مدح یا قدح تعریف وثنا یا سرزنش وملامت کا مستحق بن جاتا ہے۔

بندوق چلائی اور پوری قوت کے ساتھ اور یہ سمجھ کر کہ فلاں شخص پر جا کر لگے لیکن اتفاق سے نشانہ نے خطا کی اور گولی ہٹ کر پڑی، اس سے وہ شخص بری نہیں ہو سکتا۔ جس نے گولی کا فیر کیا تھا۔ وہ مجرم ہے اور بہرحال مجرم۔ یہ اور بات ہے کہ جو نتیجہ تھا وہ حاصل نہ ہوا۔ یا اگر وہ حملہ کسی صحیح مقصد سے اور فریضہ کے

تحت میں تھا۔ تو گولی لگا کر ہی وہ اپنے فرض سے ادا ہوا اور مدح و ثنا کا مستحق بن گیا۔ کامیابی و عدم کامیابی کا مرحلہ جدا گانہ ہے اسی کو عرب کے فلسفی شاعر نے یوں کہا ہے:۔

عَلَی الْمَرْءِ اَنْ یَسْعٰی بِمِقْدَارِ جُھْدِہٖ
وَلَیْسَ عَلَیْہِ اَنْ یَکُوْنَ مُوَفَّقًا

"انسان اپنی سعی کرے، نتیجہ کی ذمہ داری اور کامیابی و عدم کامیابی اس کے فرض سے خارج ہے"

رزق اور اس کے مختلف مراتب یہ بھی اسی مقررہ نظام عالم کے تحت میں ہیں جو اسباب و ذرائع کا پابند ہے۔

اَبَی اللّٰہُ اِلَّا اَنْ یُجْرِیَ الْاَشْیَآءَ عَلٰی اَسْبَابِھَا — خدا نے انکار کیا ہے اس بات سے کہ اشیا کی رفتار اسباب طبعیہ کے خلاف ہو۔

بے شک مشیت الٰہی بدل نہیں سکتی اور خدا کی تقدیر کے خلاف ممکن نہیں۔ لیکن دیکھنے کی ضرورت ہے کہ تقدیر الٰہی جاری کس طرح ہوئی ہے؟

اگر تقدیر الٰہی مطلق ہے اور غیر مشروط تو اس کا پورا ہونا بہر حال ضروری ہے خواہ انسان سعی و عمل کرے یا نہ، کسب معیشت میں زحمت و مشقت اٹھائے یا نہ لیکن اگر تقدیر الٰہی مشروط ہے اور قرار داد یوں ہی ہوئی ہے کہ جب انسان سعی و کوشش کرے اور جد و جہد سے

کام ہے تو اسے اتنا رزق عطا کیا جائے تو اس کا اقتضا یہ ہے کہ بس سعی و کوشش کی صورت میں وہ رزق حاصل ہو۔ بغیر سعی و طلب اور معیشت میں جدوجہد کے اس رزق کا حاصل ہونا تقدیر الٰہی کے خلاف اور معینہ قرارداد کے منافی ہے۔

اب اگر انسان ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہا اور بسر زندگی کے اسباب مہیا کرنے میں کوتاہی کا نتیجہ میں تنگدستی و احتیاج اور فقر و فاقہ کی مصیبت میں گرفتار ہوا تو اس کی ذمہ داری خود اس کے غلط طرز عمل پر ہے۔ لیکن اگر اس نے اپنے مقدور بھر جد و جہد کی اور زحمت و مشقت برداشت کی اور اس کا کچھ نہ کچھ نتیجہ حاصل ہوا تو وہ تقدیر الٰہی کا نتیجہ ہے اس لئے کہ انسان کا کام کوشش کرنا ہے۔ اور کامیابی عطا کرنا خدا کی طرف سے ہے۔

کوشش کے بعد اگر ناکامی ہو تو پھر انسان پر کوئی الزام نہیں معلوم ہوگا کہ مصلحت باری یہ ہے کہ کچھ روز تک اس کو تکالیف برداشت کرنا پڑیں، وہ صبر کا موقع ہے۔ اور اگر کامیابی ہو تو وہ خداوند عالم کی جانب سے ہے۔ اس پر شکر کا موقع ہے۔ لیکن اگر انسان نے کوشش نہ کی اور اس لئے سختی میں زندگی گزاری تو وہ اس کے ہاتھوں سے ہے۔ اس پر دوسروں کو ملامت کا موقع ہے۔

حضرت احدیت عزاسمہ نے انسان کی ذمہ داری بالکل اپنے اوپر نہیں لے لی ہے۔ تاکہ انسان کی قوتِ عمل سلب نہ ہو۔ اور اسباب مہیا کرنے کا وہ ذمہ دار ہے۔ لیکن ان اسباب میں کامیابی عطا کرنا اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ کہ انسان اپنی قوتِ عمل پر بھروسا کرکے اپنے کو اس سے بے نیاز نہ سمجھ لے اور اس کے سامنے سر تسلیم کرتا رہے۔

وہ رازق ہے یعنی عطا کرنے والا وہی ہے لیکن ان اسباب کے ذریعہ سے جنہیں انسان کو مہیا کرنا چاہیئے۔ اس طرح ایک طرف انسان جدوجہد کے فرض سے سبکدوش نہیں معلوم ہوتا اور دوسری طرف خدا پر توکل کے معنی ظاہر ہوتے ہیں۔ اور اس کی رازقیت کا عنوان معلوم ہوتا ہے۔ اس کو رازق سمجھ کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانے والے غلط راستے پر ہیں۔ جس طرح وہ جو صرف اپنی ذاتی محنت پر بھروسا کرکے اپنے کو خدا سے مستغنی سمجھنے لگے ہوں۔ کسب معاش میں زحمت و مشقت برداشت کرنے کے بعد محرومی و ناکامی سے دوچار ہونا یا دو پیشہ وروں میں جو خاص موقع و وقت، خاص صورت خاص اسباب و ذرائع کے ساتھ مصروفِ عمل ہوئے ہوں۔ ایک کو زیادہ نفع ہونا اور دوسرے کو کم۔ اس خود مختار غیبی طاقت کے کرشمے اور انسانی محدود طاقت پر اعتماد کرنے والوں کے لیئے تازیانہ عبرت ہیں۔ لیکن ناکامی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان اپنی قوتِ عمل کے صرف

کو بے کار سمجھ کر خاموش بیٹھا رہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ حقیقتاً رزق کے مسئلہ میں قضا و قدر الٰہی کس صورت پر جاری ہوئی ہے۔ یقیناً اس کو وہی بتا سکتے ہیں جو حقیقت شناس رموز قدرت اور سبق خواں مدرسۂ الوہیت ہوں۔ جن کو لوح محفوظ کے مندرجہ نقوش اور عالم تقدیر کے تمام کائنات کا براہ راست علم دیا گیا ہو۔ انہوں نے بتلا دیا کہ خدا کی رازقیت کس طرح ہے اور تقدیر الٰہی کی نوعیت کیا ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ

تِسْعَۃَ عِشَارَ الرِّزْقِ فِی الْتِجَارَۃِ — رزق کے فی صدی نوّے حصّہ تجارت میں مضمر ہیں۔

اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ بغیر تجارت فی صدی دس حصہ رزق کا حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن فی صدی نوّے حصّہ وہ ہے جو تجارت کے ساتھ مشروط ہے۔

ان کے ارشادات و ہدایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس خیال کی خاص طور پر رد کی ہے کہ خدا کے رازق ہونے کی بنا پر انسان کو جد و جہد کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے بتلایا ہے کہ انسان پر سعی و کوشش فرض ہے اور اپنے مقدور بھر ہاتھ پاؤں کو حرکت دینا لازم ہے۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال سادہ لوح افراد کے دل میں آج نہیں بلکہ بہت پہلے زمانۂ رسولؐ میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن

اس کی فوراً رد کی گئی۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

اِنَّ قَوْمًا مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰہِ لَمَّا نَزَلَتْ وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا وَّ یَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ اَغْلَقُوا الْاَبْوَابَ وَاَقْبَلُوْا عَلَی الْعِبَادَۃِ وَقَالُوْا قَدْ کُفِیْنَا فَبَلَغَ ذٰلِکَ النَّبِیَّ فَاَرْسَلَ اِلَیْھِمْ فَقَالَ مَا حَمَلَکُمْ عَلٰی مَا صَنَعْتُمْ فَقَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ تَکَفَّلَ اللّٰہُ لَنَا بِاَرْزَاقِنَا فَاَقْبَلْنَا عَلَی الْعِبَادَۃِ فَقَالَ اِنَّہٗ مَنْ فَعَلَ ذٰلِکَ لَمْ یُسْتَجَبْ لَہٗ عَلَیْکُمْ بِالطَّلَبِ

کچھ لوگ اصحاب رسول میں سے جب یہ آیت نازل ہوئی کہ جو شخص تقویٰ اختیار کرے خدا اس کے لئے کشائش پیدا کرتا ہے اور غیر معلوم طریقوں سے اس کو رزق عطا فرماتا ہے۔ تو انہوں نے دروازے گھروں کے بند کر لئے اور عبادت الٰہی میں مصروف ہو گئے۔ اور کہا کہ اب کیا ضرورت۔ خدا تمہارے رزق کا ذمہ دار ہو ہی گیا۔ یہ خبر جناب رسالتمآب کو پہنچی۔ حضرت نے ان کے پاس آدمی بھیجا اور فرمایا کہ یہ تم نے کیا کیا؟ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ خدا نے تو ہمارے لئے رزق کی ذمہ داری کر لی ہے ہم اس کی عبادت میں مصروف ہو گئے حضرت نے فرمایا۔ تمہیں معلوم

ہونا چاہیئے کہ جو ایسا کرے اس
کی کوئی دعا خداوند کریم کی بارگاہ
میں قبول نہیں ہے۔ تمہارا فرض
ہے کہ تم طلبِ معاش کرو۔

اس حدیث سے حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے اور کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ اس کے بعد بھی ائمہ معصومین ع موقع بموقع اس خیال کی کمزوری کو ظاہر فرماتے اور بتلاتے رہے کہ انسان کیلئے ظاہری اسباب و ذرائع سے بے نیاز ہونا ممکن نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو عمر بن یزید کی روایت امام جعفر صادق ع سے فرماتے ہیں:۔

اَرَأَیْتَ لَوْ اَنَّ رَجُلاً دَخَلَ بَیْتَہٗ وَاَغْلَقَ بَابَہٗ اَکَانَ یَسْقُطُ عَلَیْہِ شَیْءٌ مِّنَ السَّمَاءِ	تم خود سمجھو کہ اگر انسان گھر میں بیٹھ رہے اور دروازہ بند کر لے تو کیا چھت پھاڑ کے آسمان سے کچھ اس کو مل جائے گا؟

دوسری حدیث میں جناب رسالتمآب ص کی زبانی نقل فرماتے ہیں کہ حضرت نے فرمایا:۔

اِنَّ اَصْنَافًا مِّنْ اُمَّتِیْ لَا یُسْتَجَابُ دُعَاءُ ہُمْ	میری امت میں چند قسم کے لوگ ایسے ہیں جن کی دعا قبول نہیں ہو سکتی۔

اسی سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَرَجُلٌ یَقْعُدُ فِی بَیْتِہٖ وَیَقُوْلُ یَا رَبِّ ارْزُقْنِی وَلَا یَخْرُجُ وَلَا یَطْلُبُ الرِّزْقَ فَیَقُوْلُ اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ عَبْدِی اَلَمْ اَجْعَلْ لَکَ السَّبِیْلَ اِلَی الطَّلَبِ وَالتَّصَرُّفِ فِی الْاَرْضِ وَالْجَوَارِحِ صَحِیْحَۃً فَتَکُوْنُ قَدْ اَعْذَرْتَ فِیْمَا بَیْنِی وَبَیْنَکَ فِی الطَّلَبِ لِاِتِّبَاعِ اَمْرِی وَلِکَیْلَا تَکُوْنَ کَلًّا عَلٰی اَھْلِکَ

ایک وہ شخص جو اپنے گھر میں بیٹھا ہے اور کہے خداوندا! مجھے روزی عطا کر لیکن گھر سے نہ نکلے اور روزی کی تلاش نہ کرے تو خداوند عالم (عالم معنی ہیں) اس سے خطاب فرماتا ہے۔ کہ "اے میرے بندے کیا میں نے تجھ کو تحصیل معاش کی قوت اور اطراف زمین میں نقل و حرکت کی طاقت اور اعضاء و جوارح عطا نہیں کئے اسلئے کہ تو اپنے اعضاء و جوارح کو عمل میں لاکر میرے اور اپنے درمیان میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو جا اور اپنے اعزہ و اقارب کے لئے بار دوش نہ بن۔

تیسری حدیث ارشاد ہوتا ہے:-

اِنِّی لَاُبْغِضُ الرَّجُلَ فَاغِرًا فَاہُ اِلٰی رَبِّہٖ فَیَقُوْلُ ارْزُقْنِی وَیَتْرُکُ الطَّلَبَ

مجھ کو عداوت ہے ایسے شخص سے جو آسمان کے رخ پر منہ کھولے بیٹھا رہے "خداوند مجھکو روزی عطا کر" لیکن خود کوئی جد و جہد نہ کرے"

چوتھی حدیث امیر المومنین سے آیۂ مبارکہ اَنَّہٗ ھُوَ اَغْنٰی وَاَقْنٰی خدا ہی وہ ہے جو لوگوں کو غنی بناتا اور ان کے دلوں کو خوشنود کرتا ہے" اسکی تفسیر میں ارشاد فرمایا ہے:

اَغْنٰی کُلَّ اِنْسَانٍ بِمَعِیْشَتِہٖ وَاَرْضَاہُ بِکَسْبِ یَدِہٖ

خدا غنی بناتا ہے ہر انسان کو اسکے ذاتی کسب معاش سے اور وہ اسکے دلکو خوشنود کرتا ہے مگر

اسی کے دست و بازو کی محنت سے۔

پانچویں حدیث۔ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:۔

یَعجِزُ اَحَدُکُم اَن یَکُونَ مِثلَ النَّملَۃِ فَاِنَّ النَّملَۃَ تَجُرُّ اِلیٰ جُحرِھَا

کیا تم چیونٹی سے بھی زیادہ کمزور ہو۔ کیونکہ چیونٹی بھی اپنے سوراخ میں خود خذا کھینچ کر لیجاتی ہے

کیا اس سے بڑھ کر صاف لفظوں کی ضرورت ہے؟

مطلب یہ ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی چیز چیونٹی ہے۔ اسکے بھی خدا نے اسطرح رزق کی ذمہ داری نہیں لی ہے کہ وہ اسکو گھر بیٹھے رزق عطا کرے۔ بلکہ خود چیونٹی نکلتی ہے۔ خود اپنے کمزور پیروں سے رزق کی تلاش کرتی ہے اور اپنے مختصر دہن سے اپنے مقدار کفاف کو کھینچکر اپنے مسکن میں لے جاتی ہے۔ تو پھر تم کیا چیونٹی سے بھی زیادہ کمزور ہو کہ تم اس بات کے متوقع رہو کہ بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے تم کو گھر بیٹھے رزق عطا کیا جائے۔

چھٹی حدیث:۔ امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں اصحاب کا مجمع تھا۔ کہ علاءؒ بن کامل حاضر خدمت ہوئے اور حضرت کے سامنے بیٹھ گئے۔ عرض کیا۔ اُدعُ اللہَ اَن یَرزُقَنِی فِی طَلَبِ دَعَۃٍ "خدا سے دعا فرمائیے کہ مجھ کو راحت و آرام کے ساتھ رزق عطا فرمائے" بیشک بہت کامیاب نسخہ تجویز کیا تھا۔ امام کی دعا اور پھر اگر وہ ہو جاتی تو کیا ممکن تھا قبول نہ ہوتی؟ لیکن امام نے جواب دیا۔

لَا اَدعُو لَکَ اُطلُب کَمَا اَمَرَکَ اللہُ عَزَّ وَ جَلَّ

میں دعا نہیں کرونگا۔ جاؤ اور جیسا کہ خدا نے حکم دیا ہے خود طلب معاش کرو۔

اسی طرح کی ایک روایت کلیب صیدادی کی ہے۔

قُلتُ لِاَبِی عَبدِ اللہِ اُدعُ اللہَ لِی

میں نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کی کہ ذرا

فِی الرِّزْقِ فَقَدْ اِنْشَاَلَتْ عَلَیَّ اُمُوْرِیْ

خدا سے میرے لئے رزق کے بارے میں دعا کر دیجئے۔ اسلئے کہ میں آجکل بڑے مشکلات میں مبتلا ہوں حضرت نے فرمایا۔

لَا اُخْرُجْ فَاطْلُبْ

نہیں! گھر سے نکلو اور طلب معاش کرو

امامؑ نے دعا نہ کی۔ اسلئے کہ قوت عمل سلب نہ ہو۔ اور ذاتی محنت و کاوش سے دست کشی کر کے آرام طلبی کی عادت نہ پڑے امام موجود تھے۔ اور ان سے دعا کی خواہش آسان اور دعا کر دینا بھی معمولی امر تھا۔ لیکن امامؑ نے دعا سے انکار کر کے ہمیشہ کے لئے ایک عظیم سبق دیدیا۔ کہاں ہیں زیارت مشاہد مقدسہ سے مشرف ہونیوالے اور ضریح مطہر کے سامنے قبہ مبارک کے نیچے ہاتھ اٹھا اٹھا کر وسعت رزق اور خوشحالی و کشائش کی دعا مانگنے والے۔ دعا مانگنا آسان ہے لیکن انکو کیا معلوم کہ ضریح مبارک سے عالم معنی میں یہی آواز نہ آجاتی ہوگی کہ نہیں ہم تمہارے لئے دعا نہ مانگیں گے جاؤ اور محنت مزدوری کر کے خود اپنی روزی حاصل کرو بیشک جب انسان نے اپنی طاقت کو صرف کر دیا اور اپنے مقدور بھر سعی و کوشش کی تو اس کا فرض ادا ہو گیا۔ پھر خداوند عالم کا کام ہے کہ وہ اسکو کامیابی عطا کرے۔ کبھی وہ ایک کمزور دست و پا کی کمزور کوشش میں ایسی برکت عطا فرماتا ہے کہ بڑے بڑے طاقتور و توانا اشخاص کی جد و جہد میں حاصل نہیں ہوتی۔ اسی سے ایک تیسرے خیال کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے جس کو اکثر افراد اپنی بیکاری اور کسب معیشت میں کوتاہی کے حق بجانب ثابت کرنے کے لئے پیش کرتے ہیں اور وہ یہ کہ تجارت کیلئے سرمایہ کی ضرورت ہے اور ہمارے پاس

سرمایہ ہی نہیں تو تجارت کیونکہ کریں۔

حضور والا تجارت کسی بڑی ایجنسی بڑے کارخانہ بڑے ادارے ہی کے قائم کرنے کا نام نہیں ہے۔ کسب معیشت اور تجارت کا مفہوم اتنا وسیع ہے کہ وہ زیادہ یا کم سرمایہ پر موقوف نہیں ہے۔ وہ ہزار دل لاکھوں روپیہ سے بھی شروع ہو سکتی ہے اور دو چار پیسوں سے بھی جس طرح لاکھوں روپیہ کی تجارت شروع کرنے کے بعد انسان اپنے فرض سے ادا ہو جاتا ہے لیکن اسکی ترقی نشو ونما اور سود مندی کسی دوسری بالادست ہستی کی جانب سے ہے اسی طرح چند پیسوں کی تجارت شروع کرکے بھی انسان اپنے فرض سے ادا ہوتا ہے اور اس میں خیر و برکت عطا کرنا دوسرے کا کام ہے۔ پھر اگر انسان کے پاس بہت زیادہ سرمایہ نہیں تو اس کے معنی یہ نہیں کہ جو کچھ اُس سے ممکن ہے، اس سے بھی فائدہ حاصل نہ کرے۔

یہ سبق بھی ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے اقوال سے بہت واضح طور پر حاصل ہوتا ہے ملاحظہ ہو۔ عبدالرحمن بن حجاج کی روایت وہ کہتے ہیں کہ ہمارے ساتھیوں میں سے مدینہ میں ایک شخص تھا وہ سخت تنگدستی میں مبتلا اور فقر و فاقہ میں گرفتار ہوا۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:۔

اِذْهَبْ فَخُذْ حَانُوتًا فِي السُّوقِ وَابْسِطْ بِسَاطًا فَلْيَكُنْ عِنْدَكَ جَرَّةُ مَاءٍ وَالْزَمْ بَابَ حَانُوتِكَ ثُمَّ ذَكَرَ اَنَّهُ فَعَلَ ذٰلِكَ وَصَبَرَ فَرَزَقَهُ اللّٰهُ وَكَثُرَ مَالُهُ وَاثْرٰی	جاؤ اور بازار میں ایک جگہ مقرر کرکے فرش بچھاؤ اور بس اپنے پاس ایک صراحی پانی کی رکھ لو لیکن کسی وقت دکان پر سے ہٹو نہ۔ یعنی پابندی کے ساتھ دکان پر بیٹھو

راوی کا بیان ہے کہ اس شخص نے امام کی ہدایت پر عمل کیا۔ اور خداوند عالم نے اسی ذریعہ سے اس کو رزق عطا کیا اور کچھ دن میں اس کی ثروت میں اضافہ ہوا اور وہ مالدار ہو گیا۔ بس اب حیلہ و بہانہ کے سلسلہ میں کوئی کڑی باقی نہیں رہی اور طلب معیشت میں کسی قسم کا عذر قابل سماعت نہیں رہا۔ سرمایہ کی کمی کا عذر بالکل ناقابل سماعت قرار پا گیا ہے۔ اسلئے کہ انسان کے پاس کچھ روپیہ نہ ہو لیکن پانی تو ممکن ہے انسان اسی پانی کو لیکر لب راہ بیٹھ سکتا ہے۔ آنے جانے والوں میں پیاسوں کی کمی نہیں ہوتی ہے اور انہیں ایک پیسہ دے کر ایک کٹورا پانی پی لینے میں کوئی عذر نہیں ہو سکتا۔

یہ درحقیقت مثال ہے۔ ضروری نہیں کہ انسان پانی ہی سے تجارت شروع کرے مقصد یہ ہے کہ کم سے کم چیز جو انسان سے ممکن ہے اسی کا روزگار شروع کرے اور اپنی ذمہ داری کو پورا کر کے فرض کو انجام دے۔

اس قسم کے احادیث متعدد موجود ہیں، سید کی روایت ہے میں نے امام جعفر صادقؑ سے پوچھا۔

اَیُّ شَیْءٍ عَلَی الرَّجُلِ فِیْ طَلَبِ الرِّزْقِ	طلب معاش کے سلسلہ میں انسان کا فرض کیا ہے
فَقَالَ اِذَا فَتَحْتَ بَابَكَ وَبَسَطْتَ بِسَاطَكَ فَقَدْ قَضَيْتَ مَا عَلَيْكَ	حضرت نے فرمایا جب تم نے دروازہ کھول دیا اور زمین پر فرش بچھا کے کچھ لیکر بیٹھ گئے تو بس تم نے اپنا فرض پورا کر دیا۔

طیار کا بیان ہے کہ مجھ سے امام محمد باقرؑ نے دریافت فرمایا۔

اَیُّ شَیْءٍ تُعَالِجُ اَیُّ شَیْءٍ تَصْنَعُ	تمہارا کیا روزگار ہے کونسا کاروبار کرتے ہو؟

قُلتُ مَا اَنَا فِی شَیءٍ

میں نے عرض کیا میں تو بالکل بیکار ہوں کوئی روزگار نہیں ہے

حضرت نے فرمایا:-

خُذ بَیتًا وَاکنُس فَنَاءَہُ وَرُشَّہُ وَابسُط فِیہِ بِسَاطًا فَاِذَا فَعَلتَ فَقَد قَضَیتَ مَا عَلَیکَ

ایک جگہ مقرر کرو اور اسکو صاف کر کے پانی چھڑک کر اس میں فرش بچھاؤ اور بیٹھ جاؤ اگر تم نے ایسا کیا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اپنا فرض ادا کر دیا۔ راوی کہتا ہے۔ کہ میں نے ایسا ہی کیا اور میرے کاروبار میں ترقی ہوئی اور مجھ کو رزق عطا ہوا۔

ابو عمارہ طیار کی روایت:-

قُلتُ لِاَبِی عَبدِ اللہِ اِنَّہُ قَد ذَھَبَ مَالِی وَتَفَرَّقَ مَا فِی یَدِی وَعِیَالِی کَثِیرٌ

میں نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا کہ میرا مال سب جاتا رہا اور جو کچھ تھا وہ متفرق ہو گیا۔ اور میرے متعلقین بہت ہیں سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا کروں

حضرت نے فرمایا:-

اِذَا قَدِمتَ فَافتَح بَابَ حَانُوتِکَ وَابسُط بِسَاطَکَ وَضَع مِیزَانَکَ وَتَعَرَّض لِرِزقِ رَبِّکَ

اپنی دکان کا دروازہ کھولو اور فرش بچھاؤ اور ترازو لے کر بیٹھ جاؤ۔ اور اس طرح خداوند عالم کے رزق کا اپنے کو مستحق ثابت کرو۔

پھر اگر کچھ بھی انسان کے پاس نہ ہو کہ وہ اس سے تجارت کر سکے اور اسکو

ذرخت میں کرے تو انسان کے ذاتی اعضاء و جوارح دست و بازو کی قوت وہ تو کسی سرمایہ کی محتاج نہیں ہے۔ انسان اسی کے ذریعہ سے طلبِ معاش کر سکتا ہے چنانچہ زرارہ کی روایت ہے۔

اِنَّ رَجُلاً اَتٰی اَبَا عَبْدِ اللّٰہِ فَقَالَ اِنِّیْ لَا اُحْسِنُ اَنْ اَعْمَلَ عَمَلاً بِیَدِیْ وَلَا اُحْسِنُ اَتَّجِرُ وَاَنَا مُحَارَفٌ مُحْتَاجٌ

ایک شخص امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھے کوئی کام نہیں آتا اور تجارت کا کبھی سلیقہ نہیں بالکل فقیر و محتاج اور عاجز ہوں۔ پھر اب کیا کروں

امامؑ نے فرمایا:۔

اِعْمَلْ فَاحْمِلْ عَلٰی رَاْسِکَ وَاسْتَغْنِ عَنِ النَّاسِ فَاِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ قَدْ حَمَلَ حَجَرًا عَلٰی عُنُقِہٖ فَوَضَعَہٗ فِیْ حَائِطٍ مِنْ حِیْطَانِہٖ

بیکار نہ رہو، کچھ نہیں تو اپنے سر پر اسباب ڈھو کر مزدوری کرو اور اس طرح لوگوں سے استغناء حاصل کرو اور یہ کوئی ذلت کی بات نہیں ہے۔ رسالتمآبؐ اپنی گردن پر پتھر اٹھا کر لے گئے ہیں اور باغ میں رکھا ہے۔

اس سے چوتھے خیال کا دفعیہ بھی ہو گیا۔ جو اکثر ذہنیتوں میں پایا جاتا ہے۔ کہ تجارت جب تک کسی اعلیٰ پیمانہ پر نہ ہو وہ انسان کی حقارت کا باعث ہے اور یہ کہ مزدوری و پیشہ وری انسان کی ذلت کا سبب ہے۔ درحقیقت یہ افسوسناک خیال وہ ہے جو عام طور پر ہماری قوم کے افراد کے لئے تجارت و پیشہ وری میں سدِ راہ ہو گیا ہے۔ ہماری قوم میں پیشہ ور ذلیل نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ اور مزدوری کرنے والا پست درجہ کا شخص سمجھا جاتا ہے۔ جب تک یہ خیال راسخ

ہے اور سفید پوش طبقہ ان چیزوں کو ذلت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس وقت
تک کسی قسم کی کامیابی ہونا مشکل ہے۔ کیونکہ اس افلاس و پریشان حالی کے
عالم میں جو عام وبا کی صورت سے افراد قوم میں پھیلی ہوئی ہے یہ توقع تو کی
نہیں جا سکتی کہ ہر شخص کوئی بڑا کارخانہ یا ایجنسی یا کمپنی قائم کر سکتا ہے جو
باعزت نظر سے دیکھا جائے۔ ابھی تو جو صورت ممکن ہے وہ یہی کہ ہر شخص اپنی
بساط کے مطابق معمولی سرمایہ سے ایک کام کو شروع کرے۔ پھر جب وہ سمجھتا
ہے کہ جس دن میں نے ایسا کیا۔ اس دن سے میری جو بھی موجودہ عزت ہے وہ
خاک میں مل جائیگی۔ جو لوگ آج سلام کرتے ہیں وہ منہ دیکھ بات نہ کریں گے تو
بھلا وہ کاہے کو قدم آگے بڑھانے لگا۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ نکبت و افلاس میں
زیادتی ہوتی جائے اور قوم کا مرض ترقی کرتے کرتے ایک دن اس کو گوشۂ قبر
میں پہنچا دے۔

یہی ذہنیت وہ تھی جس کے بدلنے کے لئے ائمہ معصومین علیہم السلام نے
اپنے طرزِ عمل کے نمونے دکھلائے۔ حضرت رسول صلعم کی سیرت سے نظیریں پیش
کیں۔ اسلئے کہ دنیا میں کوئی کتنی ہی عزت حاصل کرلے لیکن اگر وہ مسلمان ہے
تو اپنے رسولؐ کی عزت کے مقابلہ کا دعوٰی نہیں کر سکتا۔ عالم امکان کی یہی
عظیم ہستی جس کی عزت کے مقابلہ میں دنیا کی عزتیں خاک سیاہ ہیں ہمکو مزدوری
کرتے نظر آرہی ہے۔ تو اب دنیا میں کون ہو سکتا ہے جو اپنی عزت کے
گھمنڈ پر مزدوری کو اپنے لئے عار و ننگ سمجھے۔

اگر ائمہ معصومینؑ کی سیرت پر نظر کیجیے تو معلوم ہوسکا کہ وہ بلند آواز سے

اعلان کر رہے ہیں کہ پیشہ ور افراد کو ذلیل نظر سے نہ دیکھو۔ صنعت و حرفت، تجارت مزدوری کو حقارت کا باعث نہ سمجھو۔ وہ لوگ جو پیشہ ور لوگوں کو ذلیل نظر سے دیکھتے ہیں اگر غور کریں تو حقیقتاً انبیاء کو ذلت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ائمہ معصومین کو بہ نظر حقارت دیکھتے ہیں۔ اسلئے کہ وہ سب محنت مزدوری کرتے تھے۔ اگر انکی عظمت کا دل پر اثر اور ان کی عزت کا لحاظ ہے۔ تو پیشہ وری ذلیل نظر سے دیکھے جانے کی مستحق نہیں ہے۔

سابقہ بیانات کے متعلق پیدا شدہ سوالات کا حل

قناعت اور اس کا مفہوم۔ مذکورہ حقائق کے مقابلہ میں جو سوالات پیش ہوئے ہیں۔ ان میں سے پہلا یہ ہے کہ قناعت کیا چیز ہے۔ اور وہ کہاں تک کسبِ معاش کے سلسلہ میں انسان کے لئے ضروری ہے اور کیا طلبِ معاش میں سعی و کوشش قناعت کے خلاف نہیں ہے۔

قناعت کے مفہوم پر جہاں تک غور کیا جاتا ہے اس کے دو شعبے ہیں۔ ایک قناعت فی الطلب اور دوسرے قناعت فی المصرف۔ کیونکہ انسان کی زندگی بھی بہ اعتبار اموال دنیا کے ان ہی دو دوروں میں منقسم ہے۔ ایک دور اموال کے جمع کرنے کا اور دوسرا دور صرف کرنے کا اور ان دونوں شعبوں میں قناعت کا عنصر کارفرما ہے۔ پہلا یعنی قناعت فی الطلب یہ ہے کہ انسان جو کچھ اسکی ذاتی محنت و مشقت کد و کاوش سے اس کو دستیاب ہو اور گاڑھی کمائی کا جو کچھ روپیہ اس کو ملے کم یا زیادہ اسی پر راضی و خوشنود ہو کر شکر خدا ادا کرے اور دوسروں کے اموال کو للچائی نظروں

سے نہ دیکھے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس کے ہاتھ آجائیں۔ مثلاً انسان نے دوکان لگائی اور دن بھر دوکان میں بیٹھا جو کچھ خدا کو منظور تھا اتنی آمدنی اس کو حاصل ہوئی۔ مزدور صبح سویرے مزدوری کرنے باہر نکلا اور اپنی ذاتی مشقت و زحمت سے دن بھر کام کیا اور جتنا منظور الٰہی تھا اتنا اس کے ہاتھ آیا۔ صناع صنعت و حرفت کے آلات لیکر بازار گیا اور جتنے کی مزدوری لگنی تھی اتنے کی لگی اور گھر واپس ہوا۔ تو یہی آمدنی جو اس کو اپنی محنت مزدوری سے حاصل ہوئی ہے۔ اسی کو وہ اپنے لئے سلطنت ہفت اقلیم کے برابر سمجھے۔ بیشک اس کو حق ہے، کہ دوسرے دن اگر اس کیلئے وسیع ذرائع مہیا ہوں تو اُن ذرائع کو عمل میں لائے اور کوشش کرے لیکن نتیجہ کو اُس کے پھر بھی خدا کے سپرد کرتے ہوئے صبر و سکون کے ساتھ اس کے استقبال پر تیار ہو۔

یہ نہیں کہ جو کچھ اپنے ہاتھ آیا۔ وہ آیا۔ لیکن نیت نہیں بھرتی۔ دوسروں کے ہاتھ میں جو اموال ہیں ان کی طرف بھی حرص و آز کی نظریں پڑ رہی ہیں۔ اور یہ فکر ہے کہ کسی نہ کسی طرح ان پر قبضہ ہو۔ اس کے لئے اگر ضرورت پڑی تو دست سوال اور موقع ہوا تو دستِ تعدی دراز کیا۔ اور اس کو حاصل کیا، یہ ہے وہ طمع و حرص جو انسانی جذبات میں سیلاب کا حکم رکھتی ہے۔ اور وہ پیدا ہونے کے بعد کسی حد محدود تک ٹھہرنا نہیں جانتی۔ اس لئے کہ خدا کی نعمت۔ لامحدود اور انسانی افراد کا تفرقہ اس میں لاانتہا ہے۔ انسان اگر جذبہ حرص رکھتا ہے تو وہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ وہ جتنی بھی کوشش کرے خدا کی تمام خدائی اس کے قبضہ میں نہ آئے گی۔ لہٰذا وہ جتنا بھی مالدار اور صاحب ثروت و اقتدار ہو جائے ہمیشہ بھوکا ہے۔ اس لئے کہ

اس کی نیت سیر نہیں ہوئی ، برخلاف اس شخص کے جو جوہر قناعت کو اپنے اس لئے ہوئے ہے ۔ وہ جد وجہد کرتا ہے اور کوشش وکاوش کی جائز حدود کو ختم کرتا ہے لیکن اس کے بعد جو کچھ اسکو مل جاتا ہے اس کو وہ اپنے لئے کافی سمجھتا ہے اور اس کی سیر چشمی اس کو آگے نظر اٹھا کر دیکھنے کی دعوت نہیں دیتی اور اب اگر شوکت شاہانہ بھی سامنے ہو اور دولت قارون بھی پیش پا ہو تو وہ اسے اپنے لئے ننگ سمجھتا ہے یہی چیز وہ ہے جس کے متعلق امیر المومنینؑ نے نہج البلاغہ میں ارشاد فرمایا ہے ۔

مَنْ اَرَادَ الْغِنَیٰ بِغَیْرِ مَالٍ فَعَلَیْهِ بِالْقَنَاعَةِ

جو بغیر مال ودولت کے غنی و تونگر بننا چاہتا ہے وہ قناعت اختیار کرے

اس قناعت کی مختصر تعبیر یہ ہے ۔ کہ

هُوَ الْكَفُّ عَمَّا فِي اَيْدِي النَّاسِ

وہ دوسروں کے ہاتھ میں جو اموال ہیں ان کے ہاتھ رو کے رہنے کا نام ہے ۔

اس طرح بھی کہ دست سوال دراز نہ کرے جو طمع اور لپیٹ فطرتی کا نتیجہ ہے اور اس طرح بھی کہ دست تعدی دراز نہ کرے ۔ جو شقاوت وقساوت ، حق کشی اور ناحق کوشی کا نتیجہ ہوتا ہے ۔ اسی کی دوسری لفظیں یہ ہیں ۔ کہ

هُوَ الرِّضَا بِالْقِسْمَةِ

وہ اپنی قسمت کے حصہ اور نصیب پر رضامندی کا نام ہے

لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان اپنے ذاتی ذرائع واسباب اور محنت و مشقت کو بھی صرف نہ کرے ۔ اسلئے کہ اس صورت میں تو جو قسمت کا حصہ اور نصیب تھا ۔ اس کے ملنے کی بھی اس کو توقع نہیں ۔ کیونکہ میں ثابت کر چکا ہوں کہ وہ ذاتی محنت ومشقت اور اسباب وذرائع کے مہیا کرنے کے ساتھ مشروط

ہے اور اس بنا پر درحقیقت اپنے طاقت و مقدور کے مطابق اسباب و ذرائع صرف کرنے سے پہلے قناعت کا محل استعمال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ ابھی اندازہ ہی نہیں ہو سکتا کہ مقسوم الٰہی اس کی نسبت کیا ہے؟ اصل قناعت کا محل استعمال اس وقت پیدا ہوتا ہے کہ جب اسباب و ذرائع ذاتی کے صرف کے بعد ایک نتیجہ پر پہنچ جائے۔ بیشک اب قناعت کا موقع ہے۔ اور اس وقت قناعت النسب و اصلح اور انسان کی شان خودداری و بلند ہمتی کیلئے موزوں و شایان بھی ہے

دوسری چیز قناعت فی المصرف ہے اس کے معنی روزمرہ کی اردو زبان میں یہ سمجھنا چاہئیں کہ جتنی چادر ہو اتنا پیر پھیلائے یعنی انسان اپنی آمدنی اور ضروریات زندگی میں توازن کو قائم رکھے یعنی انسان کی بساط ہو اتنا ہی صرف بھی کرے۔ اور اس سے زیادہ کا طالب نہ ہو یہ قناعت وہ ہے جسکی حضرت سلمانؓ نے تعلیم دی تھی۔ جب انہوں نے حضرت ابوذر غفاری کی دعوت کی اور سوکھی روٹی سامنے پیش کی جناب ابوذر کی زبان سے کہیں نکل گیا کہ اس کے ساتھ نمک بھی ہوتا تو بہت اچھا تھا۔ یہ سن کر حضرت سلمانؓ فرائض میزبانی کی نگہداشت اور مہمان کی خاطرداری کے لئے گئے۔ اپنا آفتابہ رہن کیا اور نمک خرید کر لائے۔ غذا کے تناول کے بعد حضرت ابوذر نے کہا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَعَلَنَا مِنَ الْقَانِعِیْنَ شکر ہے اس خدا کا جس نے ہم کو قناعت گذار قرار دیا۔ یہ سننا تھا۔ کہ حضرت سلمانؓ نے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا کہ یہ نہ کہو اگر قناعت گذار ہی ہوتے تو اس آفتابہ کے رہن کی نوبت نہ آتی۔ ظاہری صورت سے واقعہ بالکل معمولی ہے اور نمک کا معاملہ ہے۔ لیکن درحقیقت اس کے ضمن میں ایک عظیم

تعلیم مضمر ہے اور وہ یہی، کہ انسان کو بس جتنا موجود ہے۔ اس میں اپنے ضروریات کو محدود رکھنا چاہئے اور نمک کی بھی ضرورت ہو تو اس کو قرض رعایت، رہن وغیرہ عارضی ذرائع سے حاصل نہ کرے۔

حقیقتہً یہ قناعت وہ ہے جس کا نہ ہونا مسلمانوں کا ایک مستقل اور بہت بڑا مرض ہے جس کے لئے خاص طور سے روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ اور جس نے مسلمانوں کو یہ روز بد دیکھنا نصیب کیا ہے۔

ایک مسلمان کبھی اپنی آمدنی و خرچ کا توازن نہیں قائم رکھتا۔ حیثیت معمولی اور مصارف امیرانہ، اچھے سے اچھا لباس، اچھے سے اچھی غذا اور اگر کہیں کوئی تقریب ہو گئی جیسے شادی، زچہ خانہ، بچہ کا عقیقہ یا ختنہ وغیرہ تو پھر تو روپیہ کے وارے نیارے، وہ اولوالعزمی کہ العظمۃ للہ۔ حیثیت دس روپیہ ماہوار کی بھی نہیں۔ لیکن شادی میں ہزاروں روپیہ بیکار کے رسوم میں صرف کر دیئے۔ پھر آئیں کہاں سے؟ سودی روپیہ لیکر، مکان زمین رہن کر کے نتیجہ کیا ہوا کہ آج شادی ہوئی خانہ آبادی لیکن کل وہ شادی ناشادی اور آبادی بربادی بن گئی۔ سود بڑھتے بڑھتے اصل کے برابر یا اس سے بھی دونا چوگنا ہو گیا۔ مہاجن نے دعوے کیا اور جو کچھ مال منقولہ غیر منقولہ تھا سب اس کی نذر ہوا اور بعض اوقات نتیجہ وارنٹ اور گرفتاری تک پہنچا۔ یہ سب نتیجہ کاہے کا ہے؟ آمدنی و خرچ میں توازن نہ رکھنے اور اپنی حیثیت کو خیال نہ کرنے اور اس قناعت پر عمل نہ رکھنے کا جس کو انسان کے لئے ہر وقت اپنا نصب العین رکھنا ضروری ہے۔

یہ قناعت کے معنی ہیں نہ یہ کہ انسان ذرائع کسب معاش کو چھوڑ بیٹھے اور

کسب حلال نہ کرے۔ بلکہ عاجز و درماندہ فقر و فاقہ کی حالت میں ساکت و خاموش بیٹھا رہے

اَلدُّنْیَا زُوْرٌ لَا یُحْصَلُ اِلَّا بِالزُّوْرِ

اس حدیث شریف کے متعلق یہ سوال ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا صرف مکر و فریب ہے۔ اور بغیر مکر و فریب حاصل نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا طلب دنیا کہ جس پر سابقہ بیانات میں زور دیا گیا ہے وہ جائز کیونکر ہو سکتی ہے؟

لیکن حقیقتاً یہ سوال ہمارے سابقہ بیانات پر غور کرنے میں فروگذاشت کا نتیجہ ہے۔ ہم نے طلب دنیا کے روشن اور تاریک دونوں ہی پہلو پیش کئے ہیں۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کوئی حکم جو کسی شے کے متعلق بتلایا جائے وہ اس شے سے متضاد نہیں ہو سکتا۔ مثلاً یہ کہنا کہ بیمار صحیح ہے، سفید سیاہ ہے۔ متحرک ساکن ہے، خاموش گویا ہے، خشک تر ہے، گرم سرد ہے، وغیرہ وغیرہ غلط ہو گا۔ اس لئے کہ جب بیمار کو بیمار مان لیا تو اس کو صحیح کہنے کے کوئی معنی نہیں۔ سفید کو سفید کہہ دیا تو سیاہ نہیں اور وہ شے کہ جو متحرک ہے، ساکن نہیں اور خاموش گویا نہیں۔ اور خشک تر، گرم سرد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ متضاد اوصاف ہیں۔ جو قابل اجتماع نہیں ہیں۔

طلب دنیا جس کو میں نے اسلامی تعلیم کا جزو بتلایا ہے وہ طلب حلال ہے اور کسب جائز کا نام ہے اور بہ ظاہر ہے کہ مکر و فریب عام مواقع کے اوپر حلال و جائز نہیں۔ ناجائز و حرام ہی ہے۔ تو اب اگر متذکرہ بالا احادیث میں دنیا سے مراد یہی طلب حلال و کسب جائز ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ طلب حلال حرام ہے اور بغیر ذرائع حرام کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ جملہ

ویسا ہی ہے۔ جیسے سفید، سیاہ اور خشک، تر ہے وغیرہ وغیرہ۔

لہٰذا بمناسبت حکم یہ یقین ہے کہ دنیا سے مراد وہی دنیا ہے جس کی انتہائی تاریک تصویر میں سابق میں پیش کر چکا ہوں۔ اس سے صرف یہی حدیث نہیں بلکہ اس کے ایسے جتنے احادیث مذمت دنیا میں وارد ہوئے ہیں۔ جن کی کمی نہیں۔ بلکہ کتب احادیث واخلاق ان سے چھلک رہے ہیں۔ ان سب کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ذرائع حلال کے واسطہ سے طلب معیشت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

اَلدُّنْیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّۃُ الْکَافِرِ

اس حدیث سے بھی یہ توہم پیدا ہوتا ہے کہ جب معصوم کا ارشاد ہے کہ دنیا مومن کے لئے قید خانہ اور کافر کے لئے بہشت ہے۔ تو اب جو شخص ایمان کے درجہ پر فائز ہو۔ اس کو تو اس دنیا میں کسی راحت و آرام کی توقع ہی نہ کرنا چاہیئے۔ اور اسی زندگی کے لئے تیار رہے۔ جو قیدیوں کے لئے ہوا کرتی ہے۔ لہٰذا طلب معیشت و کسب دنیا میں کوشش سب بیکار ہے، یہ وہ خیال ہے جو حدیث کے ظاہری الفاظ سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن امام علیہ السلام نے حدیث کے صحیح معنی بیان فرما کر اس خیال کو بالکل غلط کر دیا ہے۔ وہ موقع جب امام رضا حشم و خدم کے ساتھ ایک راستہ سے گزر فرما رہے تھے۔ اور راستہ میں ایک یہودی فقر و فاقہ کی مصیبت میں گرفتار مرض میں مبتلا گلی میں پڑا ہوا تھا۔ اس یہودی نے امام کو اس شان و شوکت سے دیکھ کر حضرت کو

اپنے قریب بلایا اور کہا کہ دیکھیے۔ میں اس وقت آپ کے نانا کے قول کو غلط ثابت کرتا ہوں۔ ان کا قول ہے۔ کہ اَلدُّنْیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّۃُ الْکَافِرِ۔ اور یہ ظاہر ہے کہ آپ بموجب عقیدۂ اسلام مومن اور میں کافر ہوں۔ لیکن آپ اس وقت بہتر سے بہتر حال میں اور میں بد سے بدتر حالت میں ہوں۔ امامؑ نے فرمایا کہ تم قول رسولؐ کا مطلب صحیح نہیں سمجھے بیشک دنیا مومن کے لئے قید خانہ ہے اور کافر کے لئے بہشت۔ مگر اس کے معنی یہ ہیں کہ مومن کے لئے آخرت میں ایسی ایسی نعمتیں ہیں۔ کہ وہ ان کے مقابل میں اگر دنیا کو دیکھے تو وہ اپنی تمام زیب و زینت سمیت قید خانہ معلوم ہو گی۔ اور کافر کے لئے آخرت میں وہ سخت ترین عذاب ہیں کہ وہ ان کے مقابل میں دنیا کو دیکھے تو وہ اپنے تمام تکالیف و مصائب سمیت بہشت معلوم ہو گی۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ مومن کے لئے راحت و اکرام اور کافر کے لئے مصیبت و تکلیف کا ہونا اس دنیا میں بالکل ناممکن اور غیر قابل وقوع ہے۔

کسب معیشت کا وسیع مفہوم

سابقہ بیانات سے میرا جو کچھ بھی مقصد ہے۔ اور اسلامی تعلیمات سے جو کچھ بھی ثابت کرنا چاہتا تھا۔ وہ یہ کہ انسان کو بیکار نہ رہنا چاہئے۔ بلکہ اپنی ذاتی محنت و مشقت سے اپنی بسر زندگی کا سامان کرے اور اپنے اہل و عیال کا آزوقہ مہیا کرے۔ اور اگر قوت و طاقت و توانا

کرے تو اس سے زیادہ حاصل کرکے بندگانِ خدا کو فائدہ پہنچائے
قومی و مذہبی کاموں میں صرف کرے اور اس طرح دنیا کو تمہید آخرت
بنا کر دنیا و آخرت دونوں کا مالک ہو۔ یہی ہے کسب معیشت اور
طلب حلال کا مفہوم۔ اس کے وسائل و ذرائع کسی خاص صورت میں محدود
نہیں ہیں اور نہ اس کے لئے یہی ضرورت ہے کہ انسان دوکان رکھے
اور کسی چیز کی خرید و فروخت ہی کرے۔ جس کی وجہ سے ایک طرف
یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ آج کل تجارت میں فائدہ مفقود ہو گیا
ہے۔ جو لوگ اس شعبہ میں عمریں گذار چکے ہیں۔ وہ بھی اب ان
مشکلات سے عاجز و حیران نظر آرہے ہیں۔ جو ان کو پیش آتی ہیں۔
اور عام طور سے کسادبازاری نے ان کو فنا کے درجہ تک پہنچا دیا ہے
دوسری طرف اکثر وہ افراد جو درحقیقت کسب معیشت کے طریقہ پر
عملی طور سے قائم ہیں۔ وہ بھی کسبِ معیشت کے معنی دوکان رکھنے
ہی میں محدود سمجھ کر اپنے طرزِ عمل کی تبدیلی پر غور کر رہے ہیں۔ اس لئے
اس امر کا واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ کسب معاش کا مفہوم
اتنا محدود نہیں ہے۔ جیسا کہ خیال کیا جا رہا ہے۔ کسبِ معاش
کا مفہوم وسیع ہے۔

اپنی ذاتی محنت و مشقت کے معاوضہ میں سامان زندگی فراہم کرنا
اس کی صورتیں مختلف ہیں۔ ایک صناع جو اپنی صنعت و حرفت سے
روپیہ کماتا ہے۔ ایک معمار۔ نجار۔ بیلدار مزدور جو دن بھر کام کرتا ہے

اور اجرت لیتا ہے۔ ایک انشاپرداز جو اپنے قلمی خدمات کے ذریعہ سے زندگی گزارتا ہے۔ ایک مُدرّس جو جائز علوم کی تعلیم کے سلسلہ میں کسی کالج اسکول مدرسہ سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک طبیب جو حدودِ شرع کے اندر طبابت کی فیس لے کر بسر اوقات کرتا ہے یہ سب ہی کسب معاش اور طلبِ حلال کے فریضہ پر عملدر آمد کرنے والے ہیں۔ اور ان کا طرزِ عمل کسی حیثیت سے قابلِ اعتراض نہیں ہے۔

تقسیمِ عمل کی بنا پر طریقِ کار میں اختلاف

یقیناً تقسیمِ عمل کے اصول پر نظام اجتماعی کے لیئے یہ صورت ممکن نہیں ہے کہ سب ہی افراد دوکان رکھ لیں اور تجارت شروع کر دیں۔ اس لیئے کہ اس صورت میں اہم قومی ومذہبی واجتماعی کاروبار بند ہو جائیں گے اور نظام اجتماعی درست نہ ہوگا۔ لہٰذا ہر شخص کو اپنے فرائض وحیثیات پر نظر کرتے ہوئے خود اپنے مناسب حال طریق کار کے تجویز کرنے کا حق ہے۔ جس کے بعد اس سوال کا موقع نہیں ہے کہ تم تجارت ہی کیوں نہیں کرتے؟

یقیناً جس طرح قوم میں ضرورت ہے کہ ایک طبقہ تجّار کا ہو۔ اسی طرح ضرورت ہے کہ مثلاً ایک طبقہ علماء کا ہو وغیرہ وغیرہ۔ تاکہ نظام قومی کی تمام ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ بیشک ان میں سے ہر طبقہ کو جہاں تک ممکن ہو اپنے مناسب حال کسب معیشت کے طریقہ کو اختیار کرنا چاہیے۔ لیکن ضروری نہیں کہ وہ تجارت یا دوکانداری ہی ہو جناب

رسالتمآبؐ نے قبل بعثت اموال خدیجہؑ کی تجارت فرمائی۔ بعد بعثت تبلیغی ضرورتیں اور نبوت و رسالت کے فرائض اتنے اہم تھے کہ اب اگر قائم و دائم طریقہ سے وہی سلسلہ قائم رہتا تو حضرت کے لئے ان فرائض کا پورا کرنا ناممکن تھا۔ لہٰذا حضرت کی سیرت میں اس کے بعد سے مستمر طریقہ سے تجارت پر عملدرآمد نظر نہیں آتا۔ اور اسی طرح ائمہ معصومین علیہم السلام کی سیرت میں بھی ایسا نہیں ہے۔ کہ انہوں نے اپنی عمر ہی تجارت میں گذاری ہو اور دوکان پر بیٹھے ہوئے زندگی ختم کی ہو۔ اس لئے کہ ان کے فرائض اس سے مانع تھے۔ پس اتنا ہے کہ انہوں نے یہ دکھلانے کے لئے کہ تجارت عار و ننگ نہیں ہے۔ اور تعلیم دینے کی غرض سے کبھی کبھی یہ صورتیں بھی اختیار کر کے دکھاویں۔ چنانچہ رسالتمآبؐ کے متعلق ایک دفعہ کا تذکرہ جو نبوت کے بعد کا ہے۔ سابقاً ہو چکا ہے۔ جس کو امام جعفر صادقؑ نے اپنی حدیث میں ذکر فرمایا ہے۔ کہ

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ اِشْتَرٰی عِیْرًا اَتَتْ مِنَ الشَّامِ فَاسْتَفْضَلَ فِیْھَا مَا قَضٰی دَیْنَہٗ وَقَسَمَ فِیْ قَرَابَتِہٖ	رسالتمآبؐ نے شام سے ایک تجارتی قافلہ آیا تھا۔ اس کے مال کو خرید فرما کر تجارت کی اور جو نفع حاصل ہوا اس سے اپنے قروض ادا کئے اور اپنے اعزا کی خبر گیری کی۔

اور یہی صورت ائمہ معصومینؑ کی ہے۔

علماء ملت اگر تجارت اور صنعت و حرفت وغیرہ کو ننگ و عار سمجھیں

اور حقارت و توہین کی نظر سے دیکھیں تو بیشک قابل اعتراض اور تعلیمات اسلامی کے بالکل خلاف ہے۔ لیکن اگر وہ تجارت کو بہ نظر استحسان دیکھتے ہوئے خود اپنے فرائض کی بنا پر اس کو بطور پیشہ اختیار نہ کریں۔ اور دوسرے جائز و مستحسن ذرائع سے اپنے کسب معیشت کا سامان کریں تو اس اعتراض کا کوئی حق نہیں ہے کہ علماء تجارت کیوں نہیں کرتے۔

علمائے ملت اور واعظین کا فرض

بیشک علماء و واعظین پر یہ فرض ضرور عاید ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہدایات و بیانات سے قوم کی ذہنیت کو تبدیل کرنے کی کوشش کریں اور جو غلط خیالات راسخ ہو گئے ہیں، ان کی کمزوری کو واضح کریں۔ اور اس ذہنیت کو تبدیل کرنے میں اگر کسی اقدام عمل کی ضرورت ہو تو اس سے بھی دریغ نہ کریں۔ اس لئے کہ یہ غلط خیالات وہ ہیں جو قوم کو تنزل کے اس عمیق گڑھے میں لے جا رہے ہیں۔ جس سے ابھرنا دشوار نہیں بلکہ ناممکن ہوگا۔

صورت عمل یا طریق علاج

اس کے لئے ضرورت ہے کہ قوم کے افراد کو اپنی کمزوری کا احساس ہو۔ اور وہ اس کے تدارک کے لئے آمادہ ہو جائیں ہماری قوم میں انجمن سازی کا شوق ہے۔ مگر اتنا اہم کام اور وہ اب تک کسی انجمن کے خدمات سے محروم۔ ضرورت ہے کہ ہر ہر محلہ میں انجمنیں قائم ہوں خطباء و واعظین سے قوم کی اقتصادی تباہی اور تجارت

کی اہمیت پر تقریریں کرائی جائیں۔ ایسے شخص کو جو دکان رکھنا چاہے ہر قسم کی اخلاقی امداد پہنچائی جائے۔ اور اس کی دوکان کو اپنی دوکان سمجھ کر اس کے مفاد کی بہبودی پہ نظر ہو۔ جو جذبۂ قومیت کے تحت ہی ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ اس جذبۂ قومیت کے فقدان کا یہ نتیجہ ہے کہ جو بیچارہ اس سلسلہ میں قدم بھی رکھتا ہے۔ اس کو دوسرے ہی دن ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ اس لئے کہ ادھر اس نے دوکان رکھی اور احباب و برادران کو خبر ہوئی، دوسرے ہی دن آداب عرض اور سلام علیکم اپنے سابقہ تعلقات اور قدیمی دوستی و روابط کا پتہ دیتے ہوئے یہ سوال پیش ہوا کہ اتنا قرض دے دیجئے۔ اس بیچارے کے مشکلات سے کوئی غرض نہیں کہ ابھی اس کی پونجی کم ہے۔ ابتدائی منزل ہے کتنی دشواریاں پیش ہوں گی اور کیا مشکلات اس کے سامنے ہونگے یہ کچھ نہیں، غرض تو اپنے مطلب سے ہے چاہے اس کا نتیجہ جو کچھ بھی ہو اب اگر اس نے مروت و دوستی سے مرعوب ہو کر خواہش کو پورا کر دیا تو دوسرے صاحب تشریف لائے اور تیسرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوکان دوستوں کی نذر ہوگئی اور نفع کے عوض نقصان اٹھانا پڑا اور اگر کہیں اس بیچارے نے اپنے مشکلات پیش کرتے ہوئے عذر کیا۔ تو بس پھر کیا تھا آئینۂ خاطر پر غبار آ گیا۔ آبگینوں کو ٹھیس لگی۔ اور کہا کہ جب اتنا بھی نہ ہوا تو اپنے ہم قوم سے فائدہ کیا۔ ہم غیروں کی دوکان سے خرید لیں گے۔ اس دوکان سے اب نہ لیں گے۔